گلاب کی ٹہنی

اے حمید



۱

"ہم خانہ بدوش ہیں۔
ہم ہوا کے ساتھ چلتے ہیں
ہمارے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں۔
ہمارا پڑاؤ رات بھر کا ہے۔
ہماری محبت رات بھر کی ہے
لوگ اپنے محبوب کو دل دیتے ہیں
ہم اپنے محبوب کو جان دیتے ہیں"

پہاڑی رات کی گہری خموشی میں اس گیت کی دھیمی دھیمی آواز نیچے وادی ں سے اٹھتی ہوئی اوپر ڈاک بنگلے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ انور ڈاک بنگلے کی خواب گاہ میں اپنی محبت کرنے والی بیمار بیوی کو سُلا کر ابھی ابھی اپنے بستر پر آکر لیٹا تھا۔ آتشدان پر رکھی ہوئی گھڑی رات کے سوا بارہ بجا رہی تھی۔ خواب گاہ کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف روشندان کھلے تھے۔ ستمبر کے مہینے کا آغاز ہو چکا تھا اور پہاڑ پر راتیں سرد ہو گئی تھیں اور خزاں کی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ کمرے میں صرف ایک مدھم سا بلب جل رہا تھا انور نے بتی گل کر دی اور بستر میں لیٹ کر کمبل اوپر کر لیا۔ کمرے میں اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے روشندانوں اور کھڑکیوں کے شیشوں میں سے آتی ہوئی دودھیا چاندنی کی چمک اندر پھیل گئی انور نے

سگریٹ سلگا لیا اور اس پُراسرار تنہائی میں آہستہ آہستہ سگریٹ پینے لگا۔ جب وہ کش لگاتا تو سگریٹ کا جلتا ہوا سرا انگارے کی طرح دہکنے لگتا۔

اس کی بیوی نجمہ دیکھنے میں بڑی خوبصورت اور صحت مند تھی لیکن اس کے داہنے پھیپھڑے پر ہلکا سا نشان پڑ گیا تھا۔ چونکہ پیسے والے لوگ بڑے وہمی ہوتے ہیں۔ اس لئے نجمہ کے باپ نے فوراً دونوں میاں بیوی کو گرمیوں میں پہاڑ پر بھیج دیا۔ نجمہ کا باپ محکمہ آثارِ قدیمہ کا ایک ذمہ دار افسر تھا اور سلسلۂ نسب سرکاری مصاحبت کی ایک طویل زنجیر سے ملتا تھا۔ نجمہ نے نفسیات کا ایم۔ اے کرنے کے بعد انور سے شادی کر لی تھی۔ یہ محبت کی شادی تھی۔ انور آرٹسٹ تھا۔ یعنی وہ واٹر کلر۔ آئل کلر۔ اور پینٹل کلر میں تصویریں بناتا تھا۔ جن دنوں وہ نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اس کی ملاقات نجمہ سے ہو گئی۔ نجمہ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں نفسیات کے ایم۔ اے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ان کے تعلقات کافی استوار ہو گئے اور جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر ہوا کرتا ہے دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ آرٹس کالج سے فارغ ہو کر انور نے سمن آباد میں ایک جگہ اپنا چھوٹا سا سٹوڈیو بنا لیا اور کمرشل کام کرنا شروع کر دیا۔ نجمہ اُسے ہر روز ملنے کے لئے اس کے سٹوڈیو آتی۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ بڑے اعتماد سے انور کے پاس آتی اور گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر واپس چلی جاتی لاہور ایسے شہر میں دونوں کی محبت کا سکینڈل بن جاتا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی جب یہ بات نجمہ کے باپ کے کانوں تک پہنچی تو سنجیدہ مزاج اور ذمہ دار باپ نے لڑکی کو بلا کر واقعات کی حقیقت معلوم کرنا چاہی۔

نجمہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اُس نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ انور سے محبت کرتی ہے اور صرف اسی سے شادی کرے گی۔ باپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے انور کے بارے میں چھان بین کرنا شروع کر دی۔ جب نتیجہ تسلی بخش برآمد ہوا تو ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ نجمہ کی والدہ بچپن میں ہی مر گئی تھی

اور اس کے باپ نے اُسے بڑی محبت سے پالا تھا۔ نجمہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی اس کے ہاں اور کوئی اولاد نہ تھی۔ نجمہ کے والد نے اُسے جہیز میں بہت کچھ دیا۔ بلکہ ان دونوں کو کینال بنک والے ایک پُرانے سے مکان کا آدھا حصّہ بھی دے دیا۔ تاکہ وہ آرام اور سکون سے زندگی کے دن گزار سکیں۔

نجمہ ویسے بڑی صحت مند اور خوبصورت تھی۔ گورا چٹا رنگ، بھرا بھرا جسم، چمکیلی شفاف آنکھیں اور چہرے پر کنوارپنے کی تازگی مگر شادی کے چار سال بعد اس کا رنگ پیلا سا پڑنے لگا۔ جب ڈاکٹروں کو دکھلایا تو ایکسرے کے بعد داہنے پھیپھڑے پر ہلکے سے داغ کا نشان نظر آ گیا۔ نجمہ بظاہر بالکل نہ گھبرائی کیونکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ٹی۔ بی ناقابلِ علاج مرض نہیں۔ لیکن نجمہ کے والد کو بڑا فکر دامن گیر ہوا۔ انور بھی پریشان ہو گیا۔ کیونکہ وہ نجمہ سے بے حد محبت کرتا تھا اور اس کو موت کے راستے پر گامزن کسی حالت میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ نجمہ کے باپ نے پہاڑ پر ایک ڈاک بنگلہ لے لیا اور ان دونوں کو وہاں بھجوا دیا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ پہاڑ کی آب و ہوا میں اس مہلک بیماری کے ابتدائی نقوش بڑی جلدی ختم ہو جائیں گے۔

نجمہ کے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں اُس نے بہت سے علاج کروائے تھے۔ لیکن نخلِ اُمید ہرا نہ ہوا تھا۔ انور کو اولاد وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ نجمہ کی بیماری سے پریشان ہوا تھا اس کا سوائے نجمہ کے اس دنیا میں اور کوئی ساتھی نہیں تھا۔ اس کے ماں باپ بچپن میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ایک بہن تھی جس کا انتقال شادی کے دوسرے ہی سال بحرین میں ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ چند ایک رشتہ دار ضرور تھے جنہیں انور کبھی نہیں ملا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ بڑے ثقہ قسم کے کاروباری تھے اور انور آرٹسٹ تھا۔ ان دونوں محبت کرنے والے میاں بیوی کو پہاڑ پر آئے چوتھا مہینہ گزر رہا تھا۔ اس دوران میں نجمہ کی صحت

ویسے تو بڑی اچھی ہو گئی تھی۔ رنگ بھی نکھر کر پھر سے سُرخی مائل ہو رہا تھا۔ لیکن اُسے آدھے سر کا درد اب مستقل رہنے لگا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن درد کا دَورہ پڑ جاتا۔ ہر طرح کی دوائیوں کے باوجود درد کو تین چار گھنٹوں کی شدید تکلیف کے بعد ہی آرام آتا۔

آج بھی رات کو کھانا کھانے کے بعد نجمہ کو سر درد کا دورہ پڑ گیا۔ انور نے اس کی بڑی خبر گیری کی تھی۔ اس کا سر دبایا تھا اور پھر اسے اطمینان سے سُلا کر اس کی پیشانی پر پیار سے چوم کر ابھی ابھی اپنے بستر پر آ کر لیٹا تھا۔

ابھی اُس نے سگریٹ کے تین چار کش ہی لگائے تھے کہ اُسے ایک خانہ بدوش کے گیت کے گہرے اور درد انگیز سُروں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز نیچے وادی میں سے آ رہی تھی۔ اور کمرے میں داخل ہوتے ہوتے مدھم ہو گئی تھی۔ انور کو یہ بڑا عجیب سا لگا کہ پہاڑ کی چاندنی رات میں کوئی خانہ بدوش الاؤ جلا کر بیٹھا اکتارے پر زندگی کی بے ثباتی اور محبت کی عظمت کے گیت گا رہا ہو۔ اچانک اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ کہ وہ خواب گاہ سے باہر نکل کر چاندنی رات میں اُس خوبصورت گیت کا تعاقب کرے۔ گیت کی آواز مسلسل اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ گیت کے بول گہرے اور لمبے تھے اور رُک رُک کر بلند ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اکتارے کی ہلکی ہلکی آواز بھی آ رہی تھی۔

انور نے سگریٹ راکھ دان میں بجھا دیا۔ بستر سے باہر نکل کر اس نے اوورکوٹ پہنا اور سوئی ہوئی نجمہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر پہاڑ کی ٹھنڈی ہوا اس کی پیشانی سے چھوئی اور اس کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ برآمدے میں پورے کھلے ہوئے نیلے چاند کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی

انور نے ملازم کو جگا کر کہا کہ وہ ذرا نیچے وادی میں جا رہا ہے۔

"بابوجی! اتنی رات گئے آپ نیچے
کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں دینو ——— یہ آواز سُن رہے

ہو، نا! معلوم ہوتا ہے نیچے خانہ بدوش
گا رہے ہیں۔ ذرا ان کے گیت سنوں
گا۔"

"بابوجی! یہ لوگ تو گاتے ہی رہتے ہیں
آپ اپنی نیند حرام کیوں کر رہے ہیں؟"

لیکن انور نے اس کی ایک نہ سُنی اور اتنا کہہ کر کہ وہ ذرا گھر کی حفاظت کرتا رہے، ڈاک بنگلے کا لکڑی کا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ دینو چار سال سے انور کے ساتھ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بابوجی ہٹ کے پکے ہی نہیں بلکہ عجیب عجیب شوق رکھتے ہیں۔ اُسے تو اس بات کی بھی خبر تھی کہ بابوجی اپنے کمرے میں سٹول پر ننگے بیٹھ کر تصویریں بنایا کرتے ہیں اور اس وقت کمرے میں سوائے اُن کی بیوی کے اور کوئی نہیں جا سکتا۔

آسمان پر پُورا چاند چمک رہا تھا۔ سنجان کی پہاڑیوں پر چیڑھ اور دیودار کے اُونچے لمبے درخت رات کی خاموشی میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ نیلے آسمان پر چمکیلے ستارے سفید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے اور چاند کی بے کراں روشنی میں اُن کے رنگ سفید ہو گئے تھے۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا میں چیڑھ کے جھومروں کی کی لطیف خوشبو تھی اور ٹھنڈے پتھروں کا لمس تھا۔ انور نے کوٹ کے کالر چڑھا لیے تھے اور آواز کے سُراغ میں پہاڑی کی ڈھلان پر سے نیچے وادی میں اُتر رہا تھا۔ اب آواز قدرے صاف سنائی دینے لگی تھی۔ چوڑی سی پتھریلی سڑک چھوڑ کر وہ بائیں ہاتھ کو چیڑھ کے خاموش جھنڈوں میں سے گزر کر دریا کے پُل کی طرف نکل آیا۔ اب یہ آواز دریا کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

یہاں دریا دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور اس کا پاٹ پچاس ساٹھ گز سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ پانی کی رفتار بڑی تیز تھی۔ چاندنی میں پانی کی لہریں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکرا کر ہلکا ہلکا جھاگ پیدا کر رہی تھیں اور بڑی تیزی سے آگے نکل رہی تھیں۔ دریا پر لکڑی کا ایک چھوٹا اور تنگ سا پُل بنا ہوا تھا۔ انور یہ پُل بھی

عبور کر گیا۔ اب وہ دریا کے دوسرے کنارے پر تھا۔ جہاں ایک درختوں بھرے ٹیلے
کے پہلو میں چھوٹا سا میدان وادی بن کر پھیل گیا تھا۔ گیت کی آواز اب صاف سنائی دینے
لگی تھی اور انور کو چلتے چلتے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نہ کسی درخت یا چٹان کے پیچھے وہ
اس گانے والے کو جا لے گا جو اس پُراسرار چاندنی رات میں اپنے اکتارے پر محبت
بھرے گیت بکھیر رہا ہے اور جس کی پُر اثر درد بھری آواز اُسے اپنے ڈاک بنگلے
سے کھینچ کر یہاں لے آئی تھی۔

ٹیلے پر ہلکی سی چڑھائی تھی۔ پتھریلا جنگلی راستہ پتھروں، جنگلی جھاڑیوں اور چیڑھ
کے لمبے لمبے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے درختوں کے بیچ میں سے ہو کر جاتا تھا۔ انور
چڑھائی چڑھنے لگا۔ جب وہ ٹیلے کے اوپر پہنچا تو ٹھٹھک سا گیا۔ اس کی آنکھیں
کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ وہیں درخت کا سہارا لے کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

اس کے بالکل سامنے، ذرا نیچے درختوں کے جھرمٹ کے پاس آگ کا الاؤ
روشن تھا۔ کچھ خانہ بدوش مرد عورتیں نصف دائرے کی شکل میں اس جلتی ہوئی آگ
کے گرد بیٹھی تھیں اور ان کے درمیان ایک خانہ بدوش لڑکی دیوانہ وار رقص کر رہی تھی
اس کے سیاہ لمبے بال ہوا میں اس کے ساتھ گردش کھا رہے تھے۔ گلے اور کلائیوں
میں گلاب کے سرخ پھولوں کے گجرے تھے۔ الاؤ کی روشنی میں اس کے ننگے پیٹ
کی تمتماتی ہوئی جلد اور سانولے گول گول چہرے کا پسینہ چمک رہا تھا۔ ایک آدمی
اکتارہ ہاتھ میں لئے ذرا پرے بیٹھا گیت گا رہا تھا۔ اور اکتارے پر تال کی تھاپ
بھی دیے رہا تھا۔ رقص کرنے والی وحشیوں کی طرح ناچ رہی تھی۔ کبھی دونوں ہاتھ
ہوا میں یوں پھیلا دیتی جیسے کسی کو آغوش میں لے کر بھینچ ڈالنے کی تمنا کر رہی ہو۔ کبھی
یوں جھپٹتی گویا منہ نوچ لینا چاہتی ہو۔ کبھی یوں ایک دم سمٹ جاتی جیسے اچانک کسی
شے سے ڈر گئی ہو اور کبھی یوں اپنے خوبصورت نیم عریاں جسم کو گردش دیتے ہوئے
آگ کے گرد چکر کھانے لگتی جیسے آگ کی دیوی کی پوجا کر رہی ہو اور اس کے شعلوں
پر اپنی جوانی کا نذرانہ پیش کرنے والی ہو۔

انور حیران سا ہو کر رہ گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار جذبات کے اس قدر
گہرے، شوخ اور بے باک رنگ دیکھے تھے۔ اس نے کبھی گلاب کے سرخ پھول
کو آگ، خون اور عورت کے پسینے کی خوشبو اڑاتے محسوس نہیں کیا تھا۔ الاؤ کے
شعلوں میں اُسے لاکھوں کروڑوں پھولوں کی پنکھڑیاں خون میں نہا کر جلتی ہوئی، اڑتی
ہوئی نظر آئیں۔ لڑکی کے گہرے سیاہ بال پھنکارتے ہوئے سانپوں کی طرح لہرا رہے
تھے اور لڑکی کے گہرے سانولے، نیم عریاں جسم سے ان سانپوں کا زہر سبز پسینہ
بن کر زمین پر ٹپک رہا تھا۔

انور کسی پُراسرار قوت کے زیر اثر کھنچتا ہوا ٹیلے سے نیچے اتر گیا اور ان خانہ
بدوشوں کے ساتھ الاؤ کے گرد ایک جگہ بیٹھ گیا۔ خانہ بدوشوں کے سردار اور چند
ایک دوسرے خانہ بدوشوں نے انور کو ایک نظر دیکھا اور پھر نگاہیں رقص کرنے والی
دوشیزہ کے جسم پر گاڑ دیں۔ انہوں نے انور کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ رقص جاری
رہا۔ الاؤ میں خشک جھاڑیاں چٹختی رہیں۔ گلاب کے سرخ پھول آگ میں جلتے
رہے۔ سانپ پھنکارتے رہے اور ان کا زہر پسینے کے قطرے بن کر زمین پر
گرتا رہا۔

"......

ہماری محبت رات بھر کی ہے۔
ہمارا پڑاؤ رات بھر کا ہے۔
ہم ہوا کے ساتھ ساتھ .....

گیت گانے والی کا چہرہ پتھر کی طرح کرخت تھا اور گاتے ہوئے اس کی
رگیں کھچ جاتیں اور چہرہ تانبے کی طرح دمک اٹھتا۔ انور اب رقص کرنے والی کو
بڑے قریب سے دیکھ رہا تھا۔

یہ خانہ بدوش لڑکی بالکل جوان تھی اور رات کے پہلے پہر کا تازہ اور کنوارا
خواب معلوم ہو رہی تھی۔ چہرہ سانولا تھا اور ناشپاتی ایسی ٹھوڑی اور پسینے سے بھرے

رخساروں پر چاندی کے ذرے سے چمک رہے تھے۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں
بند تھیں۔ کھلے بازو پسینے کی وجہ سے جھلملا رہے تھے۔ اور کندھوں تک ننگے تھے۔
اُوپر کے جسم پر سوائے سینہ بند کے اور کچھ نہ تھا اور نیچے ایک چھوٹی سی گھگریا پہن رکھی
تھی جو ناچتے ہوئے ٹانگوں کو بار بار عریاں کر رہی تھی۔ لڑکی نے رقص کرتے کرتے
ایک بار بازو کے ایک زبردست جھٹکے سے اپنا چہرہ مورنی کی طرح اُوپر اٹھایا تو
اس کی نگاہیں انور سے چار ہوئیں۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں پلکیں ذراسی
چڑھا کر حیرت کا اظہار کیا اور پھر رقص کا شعلہ بن کر تڑپنے لگی۔

سُرخ گلاب کا ایک پھول اس کی کلائی سے ٹوٹ کر انور کے پاس آ گرا۔ انور
نے پھول کو اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس پھول میں سے خون اور پسینے کی
جنگلی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ آگ جل رہی تھی۔ گیت جاری تھا۔ شعلے پیچ و تاب کھا کر اُٹھ
رہے تھے اور خانہ بدوش لڑکی رقص کر رہی تھی۔ خوشبو کی تیز اور دلوں کو چیر جانے
والی لہر تھی جو شعلہ بن کر اُڑی جا رہی تھی۔ ایک شعلہ تھا جو خوشبوؤں کے دامن میں
آگ لگاتا سانپ بن کر پھنکارتا ہوا آسمان کی پہنائیوں میں گم ہوا جا رہا تھا۔ ایک
جسم تھا جو آگ، خوشبو، رقص اور جذبات کے ہیجان کی بھٹی میں پگھل کر لاوا بن کر، سونا
بن کر، روشنی بن کر، سیال خوشبو بن کر بہتا چلا جا رہا تھا۔ درخت، پہاڑ، چٹانیں خس و
خاشاک بن کر اُڑ رہی تھیں۔ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اس لاوے میں گر گر پگھل رہے
تھے۔ اس کا کوئی آغاز نہ تھا۔ اس کی کوئی حد نہ تھی چاند چیڑھ کے درختوں کے
اُوپر آ کر رُک گیا تھا۔ حیرت زدہ تھا۔ رات اپنا چہرہ سیاہ ہتھیلی پر رکھے دم بخود
تھی۔ ستارے چشمک زنی بھول گئے تھے۔ پتھروں کے سینے میں خون کی گرمی
دوڑ گئی تھی اور اُن کے سنگین دل دھڑکنے لگے تھے۔ سارا جنگل بیدار ہو گیا
تھا۔ ساری دھرتی جاگ اُٹھی تھی۔ رقص جسم بن گیا تھا۔ جسم رقص کی لہروں میں،
رقص کے دائروں، قوسوں اور ذروں میں منتشر ہو گیا تھا۔ سرخ پھول، سیاہ
بال، آنکھیں، ننگا پیٹ، چاندی ایسی پنڈلیاں اُوپر کھچی ہوئی بھنویں، بند آنکھیں
پھیلے ہوئے بازو اور پسینے میں بھرا ہوا خوبصورت سانولا چمکتا، دمکتا چہرہ سب کچھ
رقص میں تھا، گردش میں تھا.......

انور کے دل پر چڑھا ہوا شہر کے تصنع کا ملمع خانہ بدوشوں کے اس شعلے
کی پہلی آنچ میں ہی اُترنے لگا۔ اس کے ذہن میں ان گنت ایسی تصویریں گھومنے لگیں
جن کے رنگ اُس نے آج تک کسی برش سے نہ چھوئے تھے اور جن کے خطوط اس
نے کسی پنسل سے نہ کھینچے تھے۔ یہ سُرخ رنگ خون سے بھی زیادہ سُرخ تھا۔
اُس کے شہر والے رنگ مُردہ تھے۔ بے جان تھے۔ ہاتھ لگانے سے
ٹھنڈے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس خانہ بدوش رقاصہ کی کلائی والے گلاب کے
سُرخ پھول کا رنگ زندہ، گرم اور زندگی کی حرارت سے بھرپور تھا۔ یہ رنگ
کچھ بڑبڑا رہا تھا، کچھ کہہ رہا تھا۔ اس رنگ میں نسوانی جسم کے کنوارپنے کی
مہک تھی۔ خون آشام وحشی محبت کی لچک تھی۔ جلا کر خاک کر دینے والے
شعلے کی سسکار تھی۔ پہاڑ کی بلندیوں سے گرنے والی آبشار کی ہیبت
تھی۔ جنگلی بانس کی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے زرد آنکھوں والے چیتے کی
ہوشمندی تھی۔ لپک کر ڈستے ہوئے زہریلے سیاہ ناگ کی ہلاکت
خیزی تھی اور زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلے ہوئے نوکیلے گھاس کی خود رفتگی تھی
اور گہرے سنسان جنگل کی سسکتی ہوئی دردیلی خاموشی تھی۔

انور نے جب رقص کرتی ہوئی دوشیزہ کی کلائی سے ٹوٹ کر گرا ہوا گلاب
کا پھول اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا تھا تو اس لڑکی نے دیکھ لیا تھا۔ وہ ناچتے ہی
ناچتے سوچنے لگی تھی۔ کہ یہ اجنبی کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے! اس سے
پہلے تو میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا اور پھر اس نے کتنی بیخودی کے عالم
میں گلاب کا پھول اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا ہے۔

سردار شمور نے یقیناً اُسے ایسا کرتا دیکھ لیا ہوگا۔ سردار مجھ سے بے پناہ
محبت کرتا ہے اور وہ اس محبت میں کسی کی ذراسی دخل اندازی بھی برداشت نہیں

کر سکتا۔ یہ رقاصہ لڑکی جس کا نام گلنار تھا انور کے بارے میں اسی قسم کی باتیں سوچتی رہی اور ناچتی رہی۔

اچانک گیت کے بول رُک گئے اور اس کے ساتھ ہی رقص کرنیوالی کے قدم بھی وہیں رُک گئے۔ خانہ بدوشوں نے مل کر خوشی کا نعرہ بلند کیا اور رقص کرنے والی دوشیزہ کو گھیر لیا۔ گلنار کا دم پھولا ہوا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔ سردار نے پتھر سے اُٹھ کر گلنار کے رخسار پر ہلکی سی تھپکی دی اور اُسے کلائی سے پکڑ کر اپنے ساتھ خیمے کی جانب لے گیا۔ انور وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی تک وہ اس جادو کے زیرِ اثر تھا جس نے اُسے مسحور کر دیا تھا۔ گلنار نے سردار کے خیمے میں داخل ہونے سے پہلے پلٹ کر بڑی پُراسرار نگاہوں سے انور کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے خیمے میں داخل ہو گئی۔

انور کچھ دیر وہاں بُت بنا بیٹھا رہا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس لڑکی نے پیچھے مُڑ کر اُسے اتنے غور سے کیوں دیکھا۔ لیکن اُسے اس بات سے خوشی بہت ہوئی کہ رقاصہ کے دل میں اس کا ایک ہلکا سا خیال جنم لے چکا ہے۔ الاؤ کی آگ اب آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگی تھی اور خانہ بدوش عورتیں اور مرد اپنے اپنے خیموں میں آرام کرنے کے لئے جانے لگے تھے جب ایک بوڑھا خانہ بدوش بکرے کی سفید پوستین کندھے پر ڈالے رسی کا گچھا لپیٹتا ہوا اس کے قریب سے گزرا تو انور نے اس سے پوچھا۔

"کیا ـــــ کیا تم لوگ خانہ بدوش ہو بابا؟"

بوڑھے کی گردن گھٹی ہوئی تھی اور چہرہ سفید بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے انور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں ـــــ مگر تمہیں اس سے مطلب؟ اچھا بھلا یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو؟ میں کتنی دیر سے تمہیں یہاں بیٹھے دیکھ

رہا تھا۔"

"میں ـــــ میں اوپر رہتا ہوں۔ ڈاک بنگلے میں۔ آپ لوگوں کا گانا سننے یہاں آ گیا۔ کیا میں نے بُری بات کی ہے؟"

"گانا سننا کب بُری بات ہے۔ ہم خانہ بدوش تو آزاد ہیں۔ جس کا جی چاہے ہمارا گانا سُنے، ہمارا ناچ دیکھے۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا جانے لگا تو انور نے اُسے روک لیا۔

"تم لوگ کب تک یہاں ٹھہرو گے؟"

بوڑھے نے تجربہ کار آنکھوں کو سکیڑ کر انور کو دیکھا اور اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہمارا کوئی پتہ نہیں بیٹا! ٹھہریں تو مہینوں رُک جائیں اور چل پڑیں تو صبح ہی کوچ بول دیں۔"

بوڑھا خانہ بدوش قدم قدم چلتا اپنے خیمے تک گیا۔ اور پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ انور وہاں بالکل اکیلا رہ گیا۔ آسمان پر چاند مغرب کی طرف چیڑھ کے پہاڑی ڈھلان والے جنگل کے اُوپر جھک گیا تھا۔ اور میدان میں جلتی ہوئی آگ مدھم پڑ گئی تھی۔ پچھلی رات کی سرد ہوا چلنے لگی تھی جس میں چیڑھ کے جھُومر اس کے سر پر لہرا رہے تھے۔ ان کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ انور کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ چاندنی میں خانہ بدوشوں کے پیوند لگے بوسیدہ خیمے مٹی کی ڈھیریوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ جس خیمے میں رقص کرنے والی لڑکی داخل ہوئی تھی وہاں گہرا سکوت طاری تھا۔

انور کو یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح محسوس ہونے لگا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی ابھی یہاں ایک شعلۂ جوالا رقص کناں تھا۔ ابھی یہاں خوشبوؤں رنگوں، پھولوں اور شعلوں کا ایک سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں پہاڑ کے دامن میں اُوپر کی طرف اُٹھ گئیں۔ چیڑھ کے ڈھلانی جنگل میں ذرا باہر کو نکلے ہوئے ایک پتھریلے چبوترے پر ڈاک بنگلے کے روشندانوں میں بجلی کی روشنی ہو رہی تھی۔ یہ بتی کس نے جلائی وہ تو بتی گل کر کے آیا تھا۔ انور سمجھ گیا کہ اس کی بیوی نجمہ کی آنکھ کھل گئی ہے۔ اس خیال کے ساتھ کہ نجمہ پریشان ہوگی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا اُوپر ڈاک بنگلے کی طرف روانہ ہوگیا۔

نجمہ پریشانی کے عالم میں پلنگ کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ انور کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اُس کی جان میں جان آئی۔ وہ اُٹھ کر انور سے لپٹ گئی۔ اور اُس نے رُندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟ مجھے بتا کر تو جاتے۔"

"میں ذرا نیچے گیا تھا۔ میں نے سوچا تم سو رہی ہوگی تو میں واپس بھی آ جاؤں گا۔ نجمہ! تمہیں کیا بتاؤں آج میں نے خانہ بدوش لوگوں کی ایک محفل دیکھی ہے۔ زندگی تو یہ لوگ بسر کر رہے ہیں۔"

نجمہ نے ابھی تک اپنا سر انور کے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اور انور اُسے پیار کرتے ہوئے اس کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ نجمہ کو انور سے بے حد محبت تھی اور یہ اُس کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہی تھی جس کی وجہ سے انور خانہ بدوش لڑکیوں کو جا کر دیکھ لیتا تھا اور پھر نجمہ سے آ کر اُن کا ذکر بھی کر دیتا

تھا۔

"آپ اس طرح کیوں چلے گئے؟ اگر راستے میں کوئی بھیڑیا وغیرہ مل جاتا تو پھر کیا ہوتا۔ پہلے وعدہ کریں کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے یا کم از کم نوکر ساتھ لے کر جایا کریں گے۔"

انور نے مسکرا کر نجمہ کا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور اس کی آنکھوں پر پیار کیا۔

"وعدہ کرتا ہوں۔ اب تم سو جاؤ۔"

"اور آپ؟"

"میں ایک تصویر سکیچ کرنا چاہتا ہوں۔"

"صبح سہی۔ اس وقت آرام کریں۔"

"نہیں نجمہ! مجھے ابھی سکیچ کرنا ہوگا۔"

نجمہ جانتی تھی کہ وہ اس کی بات کبھی نہیں مانے گا اور سکیچ کر کے ہی رہے گا۔ چنانچہ وہ خواب گاہ کی بتی بجھا کر سو گئی اور انور نے ساتھ والے کمرے میں آ کر سکیچ بک کھول کر میز پر بچھائی اور ہاتھ کے تیز تیز اشاروں سے کاغذ کے بڑے تاؤ پر دائروں اور نیم دائروں کی شکل میں نقوش کھینچنے لگا۔ جب ذہنی تجربے کا فوری تاثر کاغذ پر آ گیا تو انور خواب گاہ میں آ کر سو گیا۔

۲

صبح اُٹھ کر انور نے ایزل پر نیا بورڈ لگایا۔ پلیٹ اور برش سنبھالا اور کاغذ پر سے بورڈ پر اُتارتے ہوئے مدھم سے خاکے میں اپنے انفرادی انداز میں ہاتھوں کے بڑے لاابالی اور بے باک اشاروں سے رنگ بھرنے شروع کر دیئے اس نے تمام کپڑے اُتار رکھے تھے۔ دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا اور وہ سٹول پر بالکل عریاں حالت میں بڑے سکون سے بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بڑی چابکدستی اور بھرپور جذباتی انداز میں کینوس پر چل رہا تھا جہاں حیرت انگیز، بوجھل گرم اور وحشت ناک رنگوں کے امتزاج سے ایک عورت کا عریاں جسم اُبھرتا چلا آرہا تھا۔

انور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کمرے میں اس کے اردگرد دو ہیٹر کمرے کو گرم کر رہے تھے۔ چائے کی کیتلی اس کے پاس پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگوں اور پیٹ پر رنگ کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں۔ سگریٹ منہ میں ہونے کی وجہ سے ہونٹ ایک طرف کو جھکے ہوئے تھے۔ دوپہر تک وہ اسی طرح کام کرتا رہا۔

دوپہر کے وقت دروازے پر ایک مخصوص دستک ہوئی انور پہچان گیا کہ اس کی بیوی کھانا لے کر آئی ہے۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک گہرا سانس لیا۔ پتلون، قمیص، سویٹر پہنا اور دروازہ کھول دیا۔ نجمہ کھانے کا ٹرے

تھامے اندر داخل ہوئی۔ انور نے بڑی سختی سے یہ پابندی لگا رکھی تھی کہ جب وہ کام کر رہا ہو تو اُسے نوکروں کی شکل نظر نہیں آنی چاہیئے۔ چنانچہ سوائے نجمہ کے اور کسی کو سٹوڈیو میں آنے کی اجازت نہ تھی۔

"بنا لی تصویر؟" نجمہ نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"صرف سکائی رہ گیا ہے۔"

"اب آپ کھانا کھالیں۔"

انور وہیں سٹول پر بیٹھ کر چمچ سے چاول کھانے لگا۔ وہ بڑے موڈ میں تھا اور نجمہ کو بڑے فخریہ انداز میں تصویر دکھانے لگا۔

"تمہیں یہ عورت غیر متوازن، بدصورت اور جنگلی معلوم ہو گی۔ لیکن خوبصورتی تہذیب اور توازن کیا ہے؟ یہ سب بکواس ہے۔ میں نے اس تصویر میں انسان کے جنگل کے ناطے کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ عورت کا بھدّا مگر پُرکشش، سحر انگیز بلاوے سے بھرپور بدن ہماری قدیم جنگلی زندگی کی علامت ہے۔ اس میں رینوے کی بوجھل حاملہ عورتوں کی جنسی دلکشی نہیں ہے۔ نہ اس میں تمہیں ڈیگاس کی ڈانسروں کے مکمل زاویے ملیں گے اس میں لاترے کی طوائف خواتین بھی نہیں ہیں جن کے اذیت ناک چہر دل

پر ہمیں نسوانی گوہرِ تابدار کی محرومی اور
شکست کا شدید احساس ملتا ہے۔ نہ
اس میں انگریس کی عریاں دُبلی پتلی
کنواریوں کا ٹھنڈا اور ہر لحاظ سے مکمل
جسم نظر آئے گا۔

اس عورت میں، اس عورت کے
گہرے کتھئی رنگ، بھری بھری کمر،
پکے ہوئے اناناس ایسی کھردری دودھ
بھری چھاتیوں اور پیٹ کی گہری سلوٹ
میں تمہیں جنگل کا اچھوتا حسن آنکھوں،
کی سحر کاری، بھرپور پُر تاکید جسم میں
جنسی پاکیزگی، حیا کا تقدس اور بدن کی
آواز ملے گی۔
گویا کہ ایک پوری مکمل عورت، تخلیق
کے جذبات میں ڈوبی ہوئی مگر گناہ کے
احساس سے بے نیاز....“

نجمہ چپ چاپ کھڑی تصویر کو دیکھتی رہی۔ اُسے انور کی ہر تصویر پسند
آجاتی تھی۔ وہ اس کی ہر تصویر کی داد دیتی اور اسے سراہتی۔ کیونکہ وہ اس سے
محبت کرتی تھی۔ اگرچہ اُسے تصویروں کے فن کا تھوڑا بہت علم ضرور تھا۔ مگر اس
کا یہ علم کتابوں تک ہی محدود تھا اور وہ اپنے اس کتابی علم کو اپنے گھریلو اور ازدواجی
حالات سے دُور ہی رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے بھی کہ انور اپنے فن کے بارے
میں بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ ایک بار شروع شروع میں نجمہ نے اس
کی ایک تصویر پر تنقید کر دی تھی تو وہ کئی روز تک اس کے ساتھ اچھی طرح

نہیں بولا تھا۔ حالانکہ وہ نجمہ کو ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ وہ جی کھول کر اس کی تصویروں
پر تنقید کر سکتی ہے تب سے نجمہ کو کان ہو گئے تھے اور اس نے کبھی انور
کی تصویروں پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی تھی۔ کیونکہ اُسے کوئی پینٹنگ پر تحقیقی
مقالہ نہیں لکھنا تھا۔ اُسے تو اپنی گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانا تھا۔

چنانچہ نجمہ نے ہمیشہ انور کی تصویروں کی تعریف کی تھی۔ بڑی واجبی سی تعریف
ایسی تعریف بھی نہیں کہ دوسرا اُسے مبالغہ ہی سمجھے۔ لیکن اس وقت جو تصویر
اُس کے سامنے ایزل پر رکھی تھی۔ اُسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انور
نے آدھی رات کو جنگل میں بلند ہونے والی کسی وحشی عورت کی چیخ کو کینوس پر قابو
کر کے اس میں رنگ بھر دیئے ہوں۔ اس جنگلی عورت کا بدن وحشی اور قدیم تھا
مگر آنکھوں میں جدید محبت کی آسودگی اور عدمِ توازن تھا۔ موٹے بھدے گہرے
سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سے ذرا پہلے کا تاثر تھا۔ سینے میں سیاہ داغ
تھے جن کے درمیان گلاب کے دو سرخ پھول بنے تھے۔ ایک ہاتھ چھاتی
کے نیچے یوں کھلا ہوا تھا جیسے کسی شے کو تھامنے کے لئے اُوپر اُٹھا ہو اور
وہیں کا وہیں جم گیا ہو۔ لیکن جیتلائی عہد کی یادگار تصویر متحرک تھی۔ اور یوں لگ
رہا تھا جیسے ابھی اپنے کینوس سے باہر نکل آئے گی۔ انور کھانا بھی کھا رہا تھا،
سگریٹ بھی پی رہا تھا، اور باتیں بھی کئے جا رہا تھا۔

نجمہ نے پوچھا۔

”معلوم ہوتا ہے رات آپ خانہ
بدوشوں سے بڑے متاثر ہوئے
ہیں۔“

انور گوشت کی ہڈی چباتے ہوئے بولا۔

”ہاں نجمہ! میں ان لوگوں سے بڑا
متاثر ہوا ہوں۔ ان کی ہر حرکت فطرت

کے قوانین سے ہم آہنگ تھی۔ گناہ
ایسے شرمناک لفظ کا ان کے ہاں
کوئی وجود نہیں۔ پھول، بڑی بڑی
پتیوں والے سرخ سیاہ قدیمی پھول
اور گھنے بے حد تاریک اور گنجان جنگلوں
میں جھانکتی ہوئی پُراسرار گرم سیاہ
آنکھیں، نجمہ! ہم لوگ معلوم ہے کیا
کرتے ہیں۔ ہمیں کسی پاک باکرہ کنواری،
لڑکی کی تصویر بنانا ہوتی ہے تو ہم ایک
بڑے ہی نرم و نازک اور ملائم اور شریفانہ
ناک نقشے والی پتلی سی لڑکی کی تصویر بناتے
ہیں۔ اس کا جسم اُوپر سے گرنے والی
پانی کی چادر کی طرح بالکل پلین ہوتا ہے
اس میں کوئی خط، کوئی قوس، کوئی لائن
نہیں ہوتی اس پر طرہ یہ کہ ہم اس کے
ہاتھ میں کنول کا چھوٹا سا سفید پھول بھی
پکڑا دیتے ہیں۔ میں تو اس نام کی
تصویر گوگاں کی طرح بناؤں گا۔

انور نے یہ بتائے بغیر کہ گوگاں کی تصویر کیا تھی، سگریٹ سلگا کر ہاتھ رومال سے پونچھے اور تصویر پر جھک کر اُسے غور سے دیکھنے کے بعد کپڑے اُتارنے شروع کر دیئے۔ نجمہ ٹرے میں برتن رکھنے لگی۔

"شاید مجھے ایک بار پھر اُن خانہ ،
بدوشوں کے ہاں جانا پڑے۔

تصویر میں ایک رنگ دکھائی نہیں
دے رہا۔"

نجمہ بولی۔

"مجھے بتلا کر جایئے گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔"

انور نے پتلون اُتار کر میز پر پھینک دی اور سٹول پر بیٹھ کر تصویر میں رنگ بھرنے لگا۔ نجمہ چپکے سے باہر نکل گئی۔ انور اپنی دُھن میں شام تک کام کرتا رہا۔ شام کو اگرچہ تصویر مکمل ہو گئی تھی مگر سکائی بالکل خالی تھا۔ درختوں کے پتے چوڑے چوڑے اور نیلے رنگ کے تھے۔ یہ پتے دنیا کے پُرانے جنگلوں اور باغِ عدن کے درختوں کی یاد تازہ کر رہے تھے انور نے کام ختم کر کے ہاتھوں کو خوب رگڑ رگڑ کر صابن سے صاف کیا اور چائے کی پیالی ہونٹوں کے ساتھ لگا کر بڑے غور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس تصویر میں اُسے اپنی گزری ہوئی زندگی کے کچھ دُھندلے نقوش دکھائی دے رہے تھے اُسے اپنے تمام سفر اور ن مپرسی میں ابھری ہوئی راتیں یاد آ رہی تھیں۔

یہاں ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ انور کی گزشتہ زندگی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا دی جائے۔ اس طرح ہمارے قاری کو اس عجیب و غریب عقائد کے مالک پینٹر کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں انور کے والدین کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے چچا کے ہاں چلا گیا، انہوں نے ہی اُسے ایف۔ اے تک کالج میں تعلیم دلوائی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لڑکا بی۔ اے کرے گا تو اُسے کسی سرکاری دفتر میں اچھی سی ملازمت دلوا دیں گے۔ لیکن انور کے سر میں آوارہ گردی کا سودا سمایا تھا۔ اسکول کے زمانے میں ہی وہ عام طور پر کلاس سے غیر حاضر رہا کرتا اور باغوں اور ریلوے سٹیشن کے علاقوں میں گھومتا رہتا۔ کالج کے زمانے میں بھی اُس نے یہ وطیرہ

جاری رکھا۔ اکثر کالج سے بھاگ کر اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں، باغوں اور شہر سے باہر دریا پار کی دیہاتی بستیوں میں گھومتا رہتا۔ چنانچہ وہ ایف۔ اے میں ایک بار فیل ہو گیا۔ ایف۔ اے دوسرے برس پاس کرنے کے بعد اُس نے ایک دوست سے کچھ روپیہ قرض لیا اور لاہور سے فرنٹیر میل میں سوار ہو کر سیدھا بمبئی پہنچ گیا۔

عام اصطلاح میں وہ گھر سے بھاگ کر گیا تھا۔ بمبئی ایسے شہر میں اُسے کوئی نہیں جانتا تھا اور کسی سے بھی اُس کی واقفیت نہیں تھی۔ سنٹرل اسٹیشن پر وہ گاڑی سے اُتر گیا اور سیدھا "رام بھروسے" ہوٹل میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس ہوٹل کا پتہ اُسے ایک چرب زبان ایجنٹ نے بتایا۔ "رام بھروسے" انور کو اچھا نام لگا۔ دراصل وہ اس شہر میں رام بھروسے ہی وارد ہوا تھا۔ انور کی شروع سے ہی یہ عادت رہی تھی کہ وہ بند دروازوں کی دوسری جانب جھانکنے کی ضرور کوشش کرتا۔ یہ اُس کی طبیعت کی جستجو تھی۔ اس کے دل میں اپنے آپ سے خواہش پیدا ہوتی کہ وہ روشندان میں سے دوسری طرف جھانک کر دیکھے کہ اس طرف کیا ہو رہا ہے۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے۔ لاہور چھاؤنی کی آبادی میں جب وہ کچھ دنوں کے لئے ایک مکان میں ٹھہرا تو ساتھ والے کمرے میں اس مکان کا کبڑا درزی اپنی نئی نویلی اور نٹ کھٹ بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ انور نے درمیان والے بند دروازے میں بڑی جانفشانی سے ایک چھوٹا سا سوراخ کر رکھا تھا۔ رات کو وہ اُس سوراخ کے ساتھ آنکھ لگا کر کرسی پر بیٹھ جاتا اور ان دونوں کا ڈرامہ دیکھا کرتا۔ کبڑا درزی لنگڑے بھالو کی طرح اُچھلتے ہوئے عجیب مضحکہ خیز صورتیں بنایا کرتا۔ وہ لنگوٹ باندھے بستر پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹا رہتا اور اس کی بیوی حقے کی چلم میں اس کے لیے آگ رکھ رہی ہوتی۔ پھر دونوں مل کر ماہیا گاتے اور پھر بچوں کی طرح ایک دوسرے کے گلے لگ کر سو جاتے۔

انور کو انسان کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی مکروہ اور بڑی خوبصورت لگتیں وہ خیال کرتا کہ انسان ایک گھناؤنا جانور ہے جس نے دن کے وقت باہر نکلنے کے لئے شریفانہ لباس بنوا رکھا ہے۔ وہ تنہائی میں بالکل جانور ہوتا ہے اور پھر اس جنگل میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ ایک دن اپنے دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

چنانچہ رام بھروسے ہوٹل میں بھی اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہاں ایک کونے میں لکڑی کا دروازہ تھا جس کے تالے پر زنگ لگ رہا تھا۔ یہ دروازہ دوسری طرف سے کیل ٹھونک کر بند کر دیا گیا تھا۔ انور کو بڑی جستجو ہوئی کہ دوسری طرف کیا ہے۔ آخر اس نے بیرے سے پوچھ ہی لیا۔

"کیوں بھئی! اس طرف کیا ہے؟"

"باتھ روم صاحب! دوسرے کمرے کا باتھ روم۔"

"ادھر کون رہتا ہے؟"

"ایک فیملی رہتی ہے صاحب! صاحب لوگ جیٹی پر کام کرتا ہے۔"

انور نے ایک چھوٹے سکریو سے غسل خانے کے بند دروازے میں ایک طرف باریک سا سوراخ کر دیا اور فرصت کے وقت وہ اس سوراخ سے لگا عجیب و غریب تماشے دیکھا کرتا۔ بچپن ہی میں انور کی یہ خواہش ہوا کرتی کہ وہ اچانک کسی گھر میں چلا جائے اور جا کر دیکھے کہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں۔ یا پھر کسی روشندان سے لگا گھر والوں کی تمام حرکات کا جائزہ لیتا رہے اور اُسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس غسل خانے میں وہ کبھی ایک لڑکی کو کبھی اس کی ماں اور کبھی اس کے باپ کو نہاتے ہوئے دیکھتا۔ لڑکی عیسائی تھی اور وہ سب سے زیادہ دیر غسل خانے میں رہتی۔ کافی سے بدن پر خوب خوب صابن ملتی اور پرانے سے گھسے پٹے اسفنج سے رگڑ رگڑ کر جلد کو گورا بنانے کی کوشش کرتی انور منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسا کرتا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر غسل خانے والے شکستہ آئینے میں سے اپنی مرجھائی

ہوئی چھاتیوں کا جائزہ لیا کرتی۔ ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن جانے کیا بات تھی کہ اُس کے بدن میں تازگی، زندگی اور صحت مندی نام کو نہیں تھی۔ خدا جانے یہ بمبئی کی آب وہوا، کم خوراکی یا کس بات کا اثر تھا کہ نوجوانی کے عالم میں ہی یہ لڑکی مرجھانے لگی تھی۔ انور نے ڈرائنگ کاپی پر اس لڑکی کے نہاتے ہوئے کئی ایک سکیچ بنائے بعد میں جب وہ لاہور میں باقاعدہ پینٹر بن گیا۔ تو اُس نے "غسل کرتی لڑکی" کے عنوان سے اس لڑکی کی ایک بڑی پُراثر تصویر بنائی تھی۔ لوگوں نے اس سوکھی ساکھی مرجھائی ہوئی کالی سی عریاں عیسائی لڑکی کو پسند نہیں کیا تھا۔ اور یونیورسٹی کی نمائش میں تو لوگوں نے لاگ بک میں اس تصویر کے بارے میں بڑے توہین آمیز ریمارک لکھے تھے۔

انور سارا دن بمبئی کی سڑکوں، سینما ہالوں، باغوں، پارکوں اور ساحلِ سمندر کی سیر کرتا رہتا اور رات کو سونے کے لئے ہوٹل میں آجاتا۔ اس کے پیسے ختم ہونا شروع ہو گئے تھے انور کا خیال تھا کہ شاید اُسے کسی فلم سٹوڈیو میں رنگ سازی کا کوئی کام مِل جائے۔ مگر اس کا یہ خیالِ خام ثابت ہوا۔ مہینہ بھر کی دربدری کے بعد بھی اُسے کام نہ مل سکا۔ ادھر پیسے قریب قریب ختم ہو گئے۔ انور اگرچہ پریشان تھا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ سارا دن وہ سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور شام کو یا کسی روز دوپہر کو اپنے کمرے میں آکر غسل خانے والے دروازے کے سوراخ سے لگ کر بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس کالی عیسائی لڑکی کا معائنہ کرتا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتا۔ کبھی وہ کوئی کتاب اُٹھا کر زور سے دیوار کے ساتھ مارتا اور مٹھیاں بھینچ کر کمرے سے باہر نکل جاتا۔

ایک روز چوپاٹی پر انور کی ملاقات ایک گھنگھریالے بالوں والے موٹر مکینک سے ہو گئی۔ اس دُبلے پتلے سیاہ رُو آدمی کا نام شکیل تھا اور اس بد صورت شخص نے اپنے نام کی کافی مٹی پلید کر رکھی تھی۔ شکیل نے اُسے موٹروں کے ایک چھوٹے سے ورکشاپ میں حساب کتاب لکھنے پر نوکر کروا دیا۔ انور کو پچاس روپے مہینہ مِل

جاتے۔ ورکشاپ کے قریب ہی ایک باڑی میں انور نے پانچ روپے ماہوار کرائے پر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی لے لی۔ اس کوٹھڑی کی دیواروں کا پلستر سیل کی وجہ سے اُکھڑ گیا تھا اور کلر زدہ فرش پر تل چٹے رینگا کرتے۔ کوٹھڑی میں سوائے ایک چارپائی اور لوہے کی کرسی کے اور کچھ نہ تھا۔ انور نے کرسی پر اپنی دو چار کتابیں اور ڈرائنگ کاپی رکھی ہوئی تھی۔

ورکشاپ بوری بندر سٹیشن کے قریب ایک بڑی سڑک پر تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے مستری کام کرتے تھے اور ہر آدمی اپنی ایک الگ نوعیت رکھتا تھا ورکشاپ کا پنجابی مالک اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے باوجود اُسے ایک نوجوان لڑکے سے بڑی محبت تھی جسے وہ خوب پیسے دیا کرتا اور خوب کھلایا پلایا کرتا۔ مالک کی آنکھیں چندھیائی ہوئی سی تھیں اور چہرہ سوکھ کر انجور ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی بڑی صحت مند، مدبر اور نیک دل عورت تھی۔ بچے بڑے پیارے اور بھولے بھالے تھے۔ روز شام کو گاڑی میں بیٹھ کر چوپاٹی اور جوہو کی سیر کو جایا کرتے۔ کالے کلوٹے شکیل کے سارے بدن پر خارش نکلی ہوئی تھی اور وہ اُسے ہاتھ سے کھجانے کی بجائے دیوار سے اپنا آپ رگڑا کرتا۔

جس باڑی میں انور رہتا تھا، وہاں اور بھی کئی گھرانے مقیم تھے۔ ہر کوٹھڑی میں ایک کنبہ رہائش پذیر تھا۔ ان میں گجراتی، بنگالی، مدراسی اور ہندوستانی سبھی تھے ہر روز وہاں لڑائی ہوتی اس لڑائی میں جوتوں اور گالیوں کا آزادانہ استعمال ہوتا۔ دن کو عورتیں لڑتیں۔ شام کو خاوند گھر آتے تو اُن کے کان بھرے جاتے۔ پھر رات گئے تک آدمیوں کی جنگ شروع رہتی۔ انور اپنے دروازے کے ساتھ لگا بڑی دلچسپی کے ساتھ ان مردوں عورتوں کو غصے میں گالیاں بکتے، جھاگ چھوڑتے، ہاتھا پائی کرتے اور ایک دوسرے پر جوتے اُچھالتے دیکھا کرتا۔ یہ منظر اُسے اتنا دلچسپ لگتا کہ اس کا جی چاہتا کہ یہ لڑائی کبھی ختم نہ ہو۔

پھر وہ فرصت کے وقت اُن لوگوں کے لڑائی کی حالت میں بپھرے ہوئے،

بگڑے ہوئے، بدہیئت چہروں کے سکیچ بناتا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جب یہاں دو گھروں کی آپس میں تُو تُو مَیں مَیں ہوتی تو دونوں گھروں کی مرغیاں اور مُرغ بھی آپس میں لڑائی شروع کر دیتے۔ بلیاں ایک دوسری پر غرّانے لگتیں دروازے سے دروازہ بجنے لگتا۔ بعد میں انور نے ان لوگوں کے چہروں کو اپنی کچھ تصویروں میں استعمال بھی کیا۔ انور کی کوٹھڑی سے ذرا آگے سامنے والی کوٹھڑی میں مہاراشٹر کی ایک گھاٹن اپنی لڑکی کے ساتھ رہتی تھی۔ گھاٹن کا جسم جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے، بڑا گٹھا ہوا اور مضبوط تھا پنڈلیوں میں مچھلیاں تھرکا کرتیں اور بازو کسی مزدور کی طرح بھرے بھرے تھے۔ جب وہ مٹیالی سی انگیا پہن کر گھٹنوں سے اُوپر تک اُٹھی ہوئی سُرخ دھوتی کی لانگڑی کمر میں اڑس کر انور کی کوٹھڑی کے سامنے سے ٹوکری ہاتھ میں لئے گزرتی تو انور اُسے بڑی دلچسپی سے دیکھتا۔ وہ عورت بھی کبھی نظریں چرا کر انور کی کوٹھڑی میں جھانک لیتی۔ آنکھیں چار ہوتیں تو انور ذرا سا مسکرا دیتا۔ گھاٹن ذرا سا مسکرا کر باڑی کے صدر دروازے سے باہر نکل آتی۔

اس گھاٹن کی بڑی لڑکی کا جسم دُبلا پتلا اور چھریرا تھا۔ وہ گھر کا کام کاج کیا کرتی۔ انور ان دونوں ماں بیٹیوں پر عاشق ہو گیا تھا۔ گھاٹن مچھلی مارکیٹ میں مزدوری کرتی تھی۔ اور صبح کی گئی تیسرے پہر گھر واپس آتی۔ اس کی لڑکی نے سامنے والے کوٹھڑی کے حجام سے آنکھ لڑا رکھی تھی اور دونوں دن بھر عشق لڑایا کرتے۔ انور کے دل میں گھاٹن کو دیکھ کر آگ سی جل اٹھتی اور اسے اپنا سارا بدن کسی بہت بڑے الاؤ میں بھڑکتا ہوا محسوس ہوتا۔ اُس نے اس گھاٹن کے کئی ایک سکیچ بنا رکھے تھے۔ وہ عام طور پر بالوں میں سفید پھول لگایا کرتی۔ یہ پھول دو دو تین تین دن تک باسی ہونے کے باوجود اس کے جُوڑے میں لگے رہتے۔ جب وہ انور کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرتی تو فضا میں باسی پھولوں اور ناریل کی کچی باس پھیل جاتی۔ اس بارے میں انور کو اَن گنت سُرخ آنکھیں اپنی طرف گھورتی اور اشارے کرتی دکھائی دیتیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ گھاٹن سے تعلقات استوار کر کے

رہے گا۔

اس فیصلے کے ساتھ ہی اُس نے ایک روز ہاتھ جوڑ کر گھاٹن کو پرنام کر دیا۔ گھاٹن ہنس پڑی اور اس نے کچھ نہ کہا۔ یہ سلام پرنام کئی روز تک جاری رہا۔ ایک دن انور نے اُسے کھڑا کر لیا۔ وہ کام سے واپس آ رہی تھی۔ ٹوکری اس کے ہاتھ میں تھی اور بھرے بھرے گہرے سانولے موٹے ہونٹوں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ انور نے پرنام کرنے کے بعد کہا۔

"مکھیا! بچھانگر مچھلی ملتی ہے آج کل؟"

"ہاں بابو! ملے کیوں نہ؟ پر دام بڑے چڑھ گئے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا۔ کل تھوڑی لاؤ گی میرے لیے؟"

"کتنی لاؤں؟"

"جتنی چاہے۔"

اور مکھیا ذرا سا ہنس کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دی۔ دوسرے دن صبح مکھیا ٹوکری اٹھائے منڈی جانے لگی۔ تو اس نے انور کی کوٹھڑی میں جھانک کر پوچھا۔

"کتنی مچھلی لیتی آؤں بابو؟"

"کہہ تو دیا مکھیا! جتنی جی چاہے لے آنا۔"

"پر بابو! تم خود مچھلی پکا لو گے؟"

"مچھلی؟ اری میں تو گھڑیال بھی پکا لیتا ہوں۔"

مکھیا زور سے ہنس پڑی اور چلی گئی۔ مکھیا کا خاوند اُسے چھوڑ چکا تھا۔

اس کی عمر تیس پینتیس کے قریب تھی مگر جسم بڑا مضبوط تھا اور کم عمر معلوم ہوتی تھی۔ انور سے وہ عمر میں پندرہ سال بڑی تھی۔ انور نے اس کوٹھڑی میں آکر سُنا تھا کہ مکھیا کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے اور یہ کہ رات کو کچھ مشتبہ لوگ اس سے ملنے آیا کرتے ہیں۔ ان باتوں نے انور کے جذبات کو ہوا دی تھی۔ کیونکہ طبعی طور پر وہ اس قسم کی مشتبہ چال چلن کی عورتوں کو پسند کرتا تھا۔ سیدھی سادی شریف عورتوں میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شریف عورتوں سے وہ بہت جلد بور ہو جاتا تھا۔ اُن کی صحبت میں بیٹھے بیٹھے اُسے یوں لگتا جیسے وہ برف کی سِلوں کے درمیان بیٹھا ہے اور اگر ایک گھڑی اور بیٹھا رہا تو سرد ہو کر منجمد ہو جائے گا۔ اس کے برعکس بدکردار عورتوں کی سنگت میں اُسے بھرپور صحت مندی کا احساس ہوتا۔ اور اس کا خون گرم ہو کر اس کی رگوں میں دوڑنے لگتا۔ یہ عورتیں اُسے اس لئے بھی پسند تھیں کہ وہ کسی ایک کی ہو کر نہیں رہتی تھیں اور انور عورت کے اس کردار کو پسند کرتا تھا۔ نہ وہ کسی ایک عورت کا ہو کر خود رہنا چاہتا تھا اور نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ کوئی ایک عورت اُس کے سر پر ہمیشہ کے لئے سوار کر دی جائے۔

پینٹر یا آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے عورت کے جسم میں وہ نیچر کی تخلیقی قوتوں کو پوری شدت سے کارفرما اور عریاں دیکھتا اور اس کی جستجو کرنے کے جذبے کو بڑی تسکین ملتی تین چار ماہ کی حاملہ عورت کی تصویر بنانے کا اُسے از حد جنون تھا۔ ایسی عورت اُسے ایک ایسا کھیت محسوس ہوتی جس کی جُتی ہُوئی گیلی زمین میں سے گندم کا خوشہ پھُوٹنے ہی والا ہو۔ یہ قدرت کی تخلیقی حِس کی بہت بڑی راز دا تھی اور اُس وقت وہ نیچر کی ہم مزاج اور ہم شکل معلوم ہوتی۔ مکھیا گھاٹن کے پکے ہوئے بدن میں بھی قدرت کے گہرے اسرار و رموز کی کھلی علامتیں تھیں۔ انور ان علامتوں کو اپنے سامنے عریاں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن سیدھے

تھا! مکھیا اس کی ماڈل بننے پر تیار نہ تھی۔ اس کے لئے اُسے محبت اور جنسی لگاؤ کا جال پھیلانے کی ضرورت تھی اور انور نے بڑی چابکدستی سے یہ جال پھینک دیا۔

شام کو مارکیٹ سے واپس آتے ہوئے مکھیا انور کے لئے پھانگر مچھلی کے تین ٹکڑے لیتی آئی۔ انور نے رقم ادا کر دی اور مکھیا سے کہا۔

"اب اسے تل بھی دو نا!"

مکھیا ہنس پڑی۔

"بابو! تم تو کہتے تھے کہ میں گھڑیال بھی پکا لیتا ہوں"

انور نے مکھیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"لیکن مکھیا! میں تمہارے ہاتھ کی پکی ہوئی مچھلی کھانا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری اتنی سی بات بھی نہ مانو گی؟"

مکھیا بڑے شاطرانہ انداز میں مسکرائی۔ اُسے بھی یہ پتلا دبلا نوجوان سا پنجابی لونڈا بڑا پسند تھا اور وہ خود اُس پر عورت کے کچھ بھید فاش کرنا چاہتی تھی۔ مگر پہل تو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب جبکہ انور نے اُسے دعوت دے ڈالی تھی تو وہ مچھلی پکانے پر راضی ہو گئی۔

آہستہ آہستہ انور اور مکھیا کے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ اب مکھیا انور کی کوٹھڑی میں بلا جھجکے صبح کو کسی وقت آجاتی۔ اور اُسے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز دے جاتی۔ ایک دن بمبئی شہر میں بڑی زبردست بارش ہو رہی تھی۔ سارا کاروبار بند پڑا تھا۔ کوٹھڑی کے لوگ اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں بیٹھے چائے وغیرہ بنا رہے تھے کہ مکھیا چائے کا کوپ لے کر انور کے پاس آئی۔

"بابو! یہ لو چائے پی لو۔ آج تو بڑا پانی

برس رہا ہے۔"

انور اکیلا چارپائی پر بیٹھا بڑی کاپی کرسی پر رکھے سکیچنگ کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا مکھیا کی چولی اور دھوتی بارش میں ذرا ذرا بھیگ کر اس کے مضبوط جسم سے چپک گئی ہے۔ اس کے کھردرے موٹے سیاہ بالوں کے جوڑے میں کل کے باسی پھول مرجھا کر بادامی ہو رہے تھے اور اس کے جسم سے سینک سا اُٹھ رہا تھا۔ جس طرح گرم گرم پیالی میں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔

"ارے! لاؤ لاؤ۔ مگر تم نے تکلیف کیوں کی؟"

مکھیا نے پیالی لوہے کی کرسی پر رکھ دی اور خود چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ کوٹھڑی کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا اور باہر بارش کا پانی شور مچا رہا تھا۔ انور نے چائے کے دو گھونٹ پیئے اور پیالی مکھیا کی طرف بڑھا دی۔

"تم بھی پیو نا۔"

مکھیا نے ہاتھ سے پیالی واپس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابو! ہم نے بہت پی ہے۔"

انور خاموشی سے چائے پینے لگا۔ وہ بظاہر خاموش تھا مگر اس کے جسم کے اندر کہرام مچا ہوا تھا۔ اس کا ایک ایک انگ چیخ و پکار مچا رہا تھا۔ کانپ رہا تھا۔ پھنک رہا تھا۔ جب یہ جذباتی ہیجان اس کے قابو سے باہر ہو گیا تو اُس نے پیالی جو اس کے ہاتھ میں بجنے لگی تھی، کرسی پر رکھ دی۔

"کیوں؟ پسند نہیں آئی کیا؟"

انور نے مکھیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُسے مکھیا کی آنکھوں میں بڑی پُراسرار چمک دکھائی دی۔ جیسے کوئی اندھیری رات میں لیمپ ہاتھ میں لئے جھونپڑی کے باہر کھڑا راستہ دکھائے۔ انور نے آہستہ سے مکھیا کا ہاتھ تھام لیا۔

"بہت پسند ہے مکھیا!"

مکھیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا میں جاتی ہوں بابو!"

انور بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ذرا ٹھہر جاؤ"

"نہیں بابو!"

دونوں کے رنگ اُڑے سے گئے تھے۔ دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے دُور ہو کر پیچھے ہٹ کر پھر کر ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انور نے مکھیا کو آہستہ سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اُسے یُوں لگا جیسے اُس نے پھلوں سے لدے ہوئے بھرپور درخت کو سینے سے لگا لیا ہو۔ مکھیا کا بدن کسی جگہ سے بھی نہ لچکا تھا۔ اس کے مضبوط، تنومند اور گھٹے ہوئے جسم سے ناریل کے تیل کی بو اُٹھ رہی تھی جو اس بارش والی شام کو انور کو عجیب سی لگی۔ گویا وہ انسانی تاریخ سے پہلے کے ہیبت ناک جنگل میں بالکل تنہا کھڑا ہو اور اس کے ارد گرد جوالا مکھیوں کے دہانے پھٹ رہے ہوں۔ لاوا اُگل رہے ہوں۔ عظیم الجثہ جنگلی جانوروں کی چیخیں بلند ہو رہی ہوں اور بپھرے ہوئے سمندر کی موجیں اُچھل اُچھل کر ساحلی چٹانوں کے سینے چھید رہی ہوں۔

انور نے مکھیا کے ہونٹ چوم لیے۔ مکھیا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس کا چہرہ انور کے چہرے پر جھکا ہوا تھا اور ایک ہاتھ بڑی کاپی سے انور کو ذرا پیچھے دھکیل رہا تھا۔ انور کو مکھیا کے چکنے اور سخت ہونٹوں پر پھانگ مچھلی کا گمان ہوا۔ مکھیا ہاتھ چھڑا کر مسکرا کر چلی گئی۔

اب وہ ہر دوسرے تیسرے انور کے پاس آ جاتی اور اُسے سکیچنگ کرتے دیکھا کرتی۔

"یہ تم کیا بناتے رہتے ہو؟"
"تصویریں بناتا ہوں مکھیا!"
"یہ تو الٹی سیدھی لکیریں بنی ہیں۔"
"تمہاری تصویر بناؤں؟"

مکھیا خوش ہو کر بولی۔

"ضرور بناؤ بابو!"
"لیکن مکھیا! میں تمہاری تصویر
ایک شرط پر بناؤں گا۔"

مکھیا نے منہ بنا کر کہا۔

"کونسی شرط؟"
"تمہیں سارے کپڑے اُتارنے ہوں
گے۔"

مکھیا نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

"ارے باپ رے باپ ——
تمہیں ایسا کہتے لاج نہیں آتی بابو!!
بھلا میں کپڑے کیسے اُتار دوں؟
نابابا! میں تو ایسا نہیں کروں گی۔"

مگر ایک رات جبکہ سارا شہر سو رہا تھا اور کٹڑی میں ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ دن بھر کی مشقت کے بعد تھکے ہارے لوگ گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مکھیا چپکے سے انور کی کوٹھڑی میں آگئی۔ انور نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پردہ چھوڑ دیا۔ اُس نے لالٹین ذرا سی اُونچی کر لی۔ کوٹھڑی میں ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔ مکھیا کپڑے اُتارتے ہوئے شرمانے لگی۔ انور ڈرائنگ کاغذ اور چارکول لے کر کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس نے مکھیا کو بہتیرا مائل

کیا مگر وہ شرماتی رہی۔ انور نے کاپی وہیں رکھی۔ مکھیا کے پاس جا کر اُسے پیار کیا اور آخر اُسے مجبور کر لیا۔ مکھیا نے کہا۔

"روشنی کم کر دو پھر"

انور نے لالٹین کی بتی اور نیچی کر دی۔ دراصل وہ بہت جلد اس کا سکیچ کرنا چاہتا تھا۔ اُسے یہ بھی ڈر تھا کہ کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ مکھیا اب سامنے چارپائی پر بالکل عُریاں اس طرح لیٹی تھی کہ ایک بازو اٹھا کر اُس نے سر کے پیچھے رکھا تھا ایک ٹانگ ذرا سی اُٹھائی ہوئی تھی اور دوسرا ہاتھ پیٹ پر تھا۔ انور نے باتوں ہی باتوں میں روشنی ذرا زیادہ کر دی۔ وہ مکھیا کا بھرپور جسم دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خوبصورت زبردست سیاہ بالوں والا سر سینے کی پہاڑیاں، پیٹ کی وادی اور گھاٹیاں، تاریک جنگلوں میں اُگے ہوئے سُرخ پھول اور آبنوس کے عظیم الشان درختوں ایسی ٹانگیں۔ انور قدرت کے اس حیرت انگیز ہیبت ناک منظر کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نیچر کے رُو برُو کھڑا ہے۔ وہ اس کا سانس اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی نیچر کے اس حسین ترین، پُراسرار ترین مجسمے کو چارکول کی لائنوں سے کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مکھیا تھک گئی۔

"میں تھک گئی ہوں بابو! اب کپڑے
پہن لوں۔"
"نہیں مکھیا! صرف ایک منٹ۔"
"تمہارا ایک منٹ کب ختم ہو گا بابو!"

سکیچ مکمل کر کے انور نے کاپی رکھ دی اور خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ مکھیا ویسی ہی منہ دوسری طرف کئے لیٹی رہی۔ وہ کچھ توقع کر رہی تھی۔ انور اپنی خواہش پُوری کر چکا تھا۔ اس نے اس کے قریب جا کر دیکھا مکھیا کے ننگے بازو اور

پیٹ پر بوسہ دیا اور بولا۔

"اب کپڑے پہن لو مکھیا!"

مکھیا نے تڑپ کر بڑی حیرت اور نفرت سے انور کو دیکھا۔ اٹھ کر جلدی جلدی کپڑے پہنے اور منہ پھلائے باہر نکل گئی انور بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ دوسرے روز انور نے اُسے پرنام کیا تو وہ منہ پھیر کر چل دی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مکھیا نے انور کے خلاف کٹڑی والوں میں من گھڑت باتیں پھیلانا شروع کر دیں۔ کٹڑی والے لوگ انور کے خلاف ہو گئے اور آخر ایک دن اُسے بوریا بستر باندھ کر وہاں سے کوچ کرنا پڑا۔

انور اب ورکشاپ میں ہی آ کر رہنے لگا۔ ایک پرانی موٹر میں اُس نے اپنا بستر جما لیا اور مزے سے پڑ گیا۔ یہاں اس نے ورکشاپ کے مالک کے خوش رنگ نوعمر لونڈے کو سکیچ کیا۔ اس لڑکے کی آنکھوں اور چہرے کے خطوط میں انور نے ایک نسوانی حجاب، بانکپن، تھوڑا سا غرور اور زنخا پن دکھانے کی کوشش کی۔ خارش زدہ بیمار موٹر مکینک کا اس حالت میں سکیچ بنایا جبکہ وہ کھجلی کی شدت سے نڈھال ہو کر دیوار کے ساتھ اپنا آپ رگڑ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خارش کی تکلیف اور دیوار سے رگڑ کھانے کا مزا دونوں تاثرات تھے۔

ورکشاپ کے مالک کو معلوم ہو گیا کہ انور نے اس کے نوعمر دوست لڑکے کی تصویر بنائی ہے اور اس کا مذاق اُڑایا ہے۔ اس نے انور کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اس نے چوبیس گھنٹے کے اندر اُسے تصویر نہ دی تو وہ اس کے سارے سامان کو آگ لگا دے گا۔ انور پریشان ہو گیا۔ وہ تصویر کسی حالت میں بھی اُسے نہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے موٹر مکینک شکیل کی مدد سے راتوں رات اپنا سامان ایک گھوڑا گاڑی پر رکھا اور چپکے سے ورکشاپ سے نکل کر بمبئی کی سڑکوں پر گم ہو گیا۔ انور کی جیب میں اس وقت ایک سو پانچ روپے اور کچھ آنے تھے

ہنگ کے زمانے میں یہ رقم بہت سمجھی جاتی تھی۔ وہ رات انور نے دادر سٹیشن پر گزاری۔ دوسرے روز وہ پورے ساڑھے دس بجے کلکتہ جانے والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔

۳

کلکتے پہنچ کر انور سیدھا اپنے ایک واقف کے ہاں چلا گیا۔

اُس کا یہ واقف چیت پور روڈ کے اخیر پر کالی ماتا کے مندر کے عقبی محلے میں رہتا تھا۔ اور ایک فرنیچر کی دکان پر سیلزمین کی حیثیت سے ملازم تھا۔ ایک ڈربہ نما عمارت میں اُس کے ایک چھوٹا سا تنگ کمرہ تھا جس کا فرش اُکھڑ گیا تھا اور دیواروں کی سفیدی شور ملازم تھا۔ ایک کمرہ تھا جس کا فرش اُکھڑ گیا تھا اور دیواروں کی سفیدی شور کی وجہ سے پھول رہی تھی۔ پہلے تو وہ انور کو اچانک سامنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوا۔ بلکہ پریشان ہوا۔ پھر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لا کر اس کا رسمی انداز میں خیر مقدم کیا اور تھوڑی ہی دیر بعد پُوچھنے بیٹھ گیا کہ اس کا ارادہ کلکتے میں کتنے روز قیام کا ہے۔ انور نے بھی اُسے مزید پریشان کرنے کے لیئے کہہ دیا۔

"کم از کم چھ ماہ تو رہوں گا۔ چھ ماہ سے
پہلے اتنے بڑے شہر کی سیر کیا
ہوگی؟"

سیلزمین تو بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ انور نے ایک ماہ خوب ڈٹ کر اس شخص کے ہاں کھانا کھایا۔ اس کے سگریٹ پیئے اور اپنے روپوں کو ہوا تک نہ لگائی۔ بلکہ اُلٹا اس سے پچیس روپے قرض بھی مانگ لیئے۔ وہ شخص پریشان ہو گیا اور انور کو وہاں سے چلتا کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ دراصل انور خود وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اس نے پورا ایک ماہ کلکتے کے گلی کوچوں اور

مضافات کو چھان مارا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ جا کر رہے جو صحیح بنگال ہو اور جہاں وہ بنگال، اداس بنگال کی رُوح کو چھُو سکے۔ کلکتہ شہر تو بمبئی جیسا ہی تھا سوائے اس کے کہ بمبئی میں مہاراشٹر کی دھوتی پوش گھاٹنیں تھیں اور یہاں موٹی موٹی آنکھوں والی بنگالی عورتیں اور چھوٹے چھوٹے پیچھے سے چپٹے سروں والے بنگالی مرد تھے۔ بمبئی کی طرح یہاں بھی ہر آدمی چھتری کندھے سے لگائے نظر آتا۔ اسی طرز کے ایرانی ہوٹل یہاں بھی تھے۔ ویسے ہی گندے، حبس زدہ اور بدحال کاروباری لوگ یہاں بھی تھے۔ ویسی ہی اُونچی لمبی عمارتیں یہاں بھی تھیں جن کے اندر ایک ایک کمرے میں دو دو خاندان رہتے تھے۔ موٹروں رکشوں، ٹراموں اور بسوں کی یہاں بھی بھرمار تھی۔ سبزہ، بارشیں اور سڑکوں کا شور بھی بالکل ویسا ہی تھا۔

انور کو بنگال ابھی تک دکھائی نہ دیا تھا۔ وہ بنگال میں رہنا چاہتا تھا اور اس کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ آخر ایک روز اُسے منزلِ مقصود کا سراغ مِل گیا۔ اس نے اپنے واقف میزبان کا کھانا اُس روز خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس کے سگریٹ پھونکے، چائے پی اور جب میزبان بالکل اَدھ مُوا ہو گیا تو انور نے اس کے کانوں میں اس خوشخبری کے بول ڈالے کہ وہ کل صبح چندر نگر جا رہا ہے۔ میزبان کی باچھیں کھِل گئیں۔ مگر جھوٹ مُوٹ اداس ہو کر بولا۔

"بس! تم تو کہتے تھے ابھی چھ ماہ
ٹھہروں گا۔"

انور اپنے میزبان کی بے بسی پر ہنس پڑا۔

"اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو رُک
جاتا ہوں۔"

میزبان کا رنگ اُڑنے لگا۔

"نہیں نہیں، اگر کہیں کام مل رہا ہے تو

بھئی میں تمہیں کیسے روک سکتا ہوں۔
ویسے یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب
تک جی چاہے بیٹھے رہو۔"

انور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر اپنے میزبان کا سگریٹ جلا کر بولا۔
"فکر نہ کرو دوست! میں کل یقیناً جا
رہا ہوں۔"

دوسرے روز انور نے اپنا مختصر سامان اٹھایا۔ اور سیالدہ جنکشن سے لوکل ٹرین میں بیٹھ کر بنگال کے مضافات کے [illegible]، داخل ہونے کے لیے چندر نگر کی طرف چل پڑا۔

چندر نگر اگرچہ فرانسیسی نوآبادی تھی لیکن یہاں زیادہ آبادی بنگالیوں کی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا [illegible] گلیاں تنگ اور پرانے مندروں کے گنبدوں پر کائی جم رہی تھی۔ انور نے [illegible] روز پہلے یہاں آکر ایک ہوٹل میں جہاں شراب [illegible] حاصل کر لی تھی۔ یہاں اس کا کام شراب کی بوتلوں [illegible] گلاسوں، میز پوشوں، راکھ دانوں، بار کے برتنوں کی جانچ پڑتال کرتے رہنا اور بیروں کو دیئے گئے ٹپ کا خیال رکھنا تھا۔ اسی بار میں بیروں کے کوارٹروں میں انور کو ایک چھوٹی سی کوٹھڑی مل گئی۔ انور نے یہاں آکر اپنا بستر جما لیا۔ اور بار میں کام شروع کر دیا۔

دوپہر کو چار گھنٹوں کے لیے بار بند ہو جاتی تھی۔ اور شام کو دوبارہ کھلتی تھی۔ اس دوران میں انور اکیلا اس چھوٹے سے شہر کی سیر کو نکل جاتا۔ دریائے ہگلی اس شہر کے پہلو سے ہو کر گزرتا تھا۔ شہر سے باہر جہاں کالی گھاٹ تھی وہاں شام کو خوب رونق ہوا کرتی۔ عورتیں، بچے اور مرد وہاں آکر دریا کی سیر کرتے وہی بڑے اور گرما گرم چاٹ سے جی بہلاتے۔ غریب مانجھی ایک آنے میں

دریا کے پورے پاٹ کی کشتی میں سیر کروا دیتے۔ کبھی کبھی دریا میں سے رنگون اور دوسرے ملکوں کو جانے والے بحری جہاز بھی گزرا کرتے۔ ڈیک پر کھڑے لوگ ساحلِ دریا کا تماشہ کیا کرتے اور ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے جہاز کے اوپر منڈلایا کرتے۔

انور گھاٹ کے چبوترے پر ایک طرف بیٹھا دریا کے اوپر غوطہ لگانے والے پرندوں اور کشتیوں میں سیر کرتے انسانوں کی عجیب حرکتوں کے مزے لیا کرتا۔ شام کو جب کالی گھاٹ پر لوگوں کی رونق زوروں پر ہوتی تو اُسے ہوٹل میں کام کرنا پڑتا اس ہوٹل میں زیادہ تر غیر ملکی سیاح جام لنڈھانے آتے۔ چندر نگر کے بنگالی بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اکثر کلکتے سے شراب کے رسیا نوجوانوں کی ٹولیاں بھی عیش دینے یہاں پہنچ جایا کرتیں۔ لیکن بنگالی عورتیں اس شراب خانے میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ پرتگالی، فرانسیسی اور اینگلو انڈین عورتوں کا اکثر پھیرا رہا کرتا۔ یہ عورتیں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آکر شراب پیتیں اور خرمستیاں کرتیں۔ فرانسیسی پولیس کے آدمی ہوٹل کے باہر مناسب موقعہ کے انتظار میں ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ کبھی کبھی کسی شرابی مرد کو دوسری شرابی عورت کا فراک پھاڑ دینے یا اس کی اجازت کے بغیر اس کا منہ چوم لینے کے جرم میں ہوٹل سے باہر بھی نکال دیا جاتا۔ کبھی دنگا بھی ہو جاتا سوڈے کی بوتلیں فضا میں جھنجھنائیں اور دو ایک کے سر پھٹتے اور پھر فوراً ہی پولیس موقع پر پہنچ جاتی اور دوسری لڑائی تک مکمل امن قائم ہو جاتا۔ جھگڑو نام کا ایک بنگالی بیرا شراب پینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے شراب کی عادت اپنی بیوی کو بھی ڈال دی تھی۔ دوسرے تیسرے وہ انور سے اجازت لے کر روٹی کے ڈبے میں ولایتی شراب بھر کر چوری چھپے اپنے گھر لے جایا کرتا۔ خود پیتا۔ اپنی بیوی کو پلاتا اور پھر نشے میں چور ہو کر دونوں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اور ایک دوسرے کے بال نوچتے حاجی کبیر ہیڈ بیرا تھا۔ اس نے بچپن میں ہی حج کر لیا تھا۔ وہ شراب کا دشمن تھا۔ وہ سفید

دستانے پہن کر شراب بانٹا کرتا تھا اور زبان پر ہر وقت لاحول ولا کا کلمہ رہتا فرصت کے اوقات میں وہ کاؤنٹر کی دوسری جانب بیٹھ کر دوسرے بیروں کے سامنے شراب کے نقصانات گنوایا کرتا۔ اور اُنہیں اس اُم الخبائث سے بچے رہنے کی تلقین کیا کرتا۔ جگرؔ ان کی نصیحت آموز باتیں بڑے غور سے سُنا کرتا۔ کسی وقت بیڑی بجھا کر بول اُٹھتا۔

"حاجی بابا! ایک بات تمہیں کہہ دوں
شراب نہ ہوتی تو یہ بندۂ بے دام کب
کا اس دُنیا سے نو دو گیارہ ہو چکا ہوتا!"

کسی وقت اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ حاجی کبیر سے گڑگڑا کر کہتا۔

"بابا کبیر! کبیر جی! کوئی ایسی پھونک
مار دو کہ یہ بلا سر سے ٹل جائے۔ اب
تو شراب نہ بھی پیوں تو نشہ رہنے لگا
ہے۔"

کالی گھاٹ سے کچھ ہی دُور تاڑی کے جھنڈ تلے دُرگا دیوی کا ایک مندر تھا۔ یہ چھوٹا سا مندر بڑا پُرانا تھا۔ اس کی دیواریں کالی پڑ گئی تھیں۔ اور بُرجیوں کی دراڑوں میں شیاما چڑیوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ انور صبح سویرے دریا کنارے سیر کرنے آتا تو اس مندر کے قریب سے ہو کر گزرتا۔ اُسے اس مندر کے پُراسرار ماحول سے بڑی دلچسپی ہو گئی تھی۔

وہ دُرگا دیوی کے نام اور اس کی دیوتائی تاریخ سے بالکل ناآشنا تھا۔ مگر کبھی کبھی اس مندر سے آتی ہوئی کیرتن کی آواز سُن کر اُسے یوں لگتا گویا، کوئی اجنبی دوست کئی سو سال سے اُسے مسلسل آوازیں دے رہا ہے اُسے اپنے پاس بلا رہا ہے۔ اُس نے اس مندر کے بہت سے سکیچ بھی

بنائے۔ ایک روز وہ اس مندر کے دروازے میں داخل ہو کر اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں کھڑے ایک پروہت نے کانسی کی پیالی میں بھگوئے زعفران سے اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ چھت سے لٹکے ہوئے گھنٹے کو انور نے بھی دوسرے پجاریوں کی دیکھا دیکھی ہاتھ سے بجایا اور اگلے کمرے میں آ گیا۔

یہاں چھوٹا سا کمرہ لوبان اور اگربتیوں کی تیز خوشبوؤں سے بوجھل ہو رہا تھا۔ ایک موٹا پروہت صرف دھوتی باندھے گلے میں جنیو ڈالے بتاشوں، پیسوں اور رتن جوت کے سفید پھولوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھا اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اور ماتھا ٹیکنے والے پجاریوں سے پیسے لے کر انہیں ایک بتاشہ اور پھول دے رہا تھا۔ سامنے درگا دیوی کا بُت تھا۔ جو دیوار میں سے اُبھرا ہوا تھا اور سر سے لے کر پاؤں تک سُرخ سُرخ سیندور میں لتھڑا ہوا تھا۔

پہلی بار دُرگا وتی کو انور نے اسی مندر میں دیکھا۔ سانولے رنگ کی دُبلی پتلی بنگالی لڑکی ——— کالی کنی والی سفید ساڑھی ماتھے پر رام نام کا تلک، لمبے کالے بال کھُلے، ہاتھوں میں پیتل کی تھالی جس میں سلگتا ہوا لوبان اور پُوجا کے پھُول ——— بڑی بڑی کالی آنکھوں میں محبت اور عقیدت کی مقدس خاموشی اور نیم وا ہونٹوں پر دُرگا دیوی کے بنگالی بھجن کے شبد ——— دُرگا وتی کی سانولی نازک کلائیوں میں سندوری رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ انور کو یوں لگا، جیسے وہ بنگال کے جنگلوں میں ارغوانی شام کو غروب ہوتے دیکھ رہا ہے۔ دُرگا وتی کے رنگ اور اس کے بدن کے نازک خطوط اور ان تمام باتوں کے ایک مجموعی اُداس موڈ نے بڑا متاثر کیا تھا۔

اب وہ ہر صبح دُرگا کے مندر کی سیر کو جانے لگا۔ تقریباً ہر روز دُرگا وتی سے انور کی ملاقات مندر کے اندر ہی ہوتی۔ ملاقات ان معنوں میں کہ انور اسے مندر میں پُوجا کرتے ہوئے دیکھ لیتا۔ ابھی تک وہ اس سے کسی قسم کی بات نہیں کر سکا تھا۔ ایک روز انور پُوجا کرنے کے بعد مندر سے نکل کر گھاٹ کی

طرف والے بانس کے درختوں میں ایک پتھر پر بیٹھ کر درگاوتی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ درگاوتی ہر روز ادھر سے ہی گزرتی ہے۔ چونکہ وہ بالکل تنہا آتی تھی اس لئے انور کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ یقیناً یہیں کہیں پاس ہی رہتی ہے۔ انور سگریٹ پیتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دُرگا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ آج اس نے ہلکے سبز رنگ کی بالکل سادہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پاؤں سے ننگی تھی۔ ماتھے پر روز کی طرح تلک لگا تھا اور بال کمر پر کھلے تھے بازو پہلوؤں کی طرف سمیٹے، دُبلے پتلے بدن کو چرائے وہ کسی جوگن ایسے وقار اور کنواری لڑکی ایسے گہرے شعور کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ انور نے سگریٹ پھینک دیا۔ وہ سوچنے لگا اس لڑکی سے کس زبان میں بات کرے۔ وہ بنگالن تھی اور انور پنجابی۔ نہ وہ پنجابی زبان جانتی تھی اور نہ انور بنگالی سے واقف تھا۔ لیکن بنگال میں ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی خوب چلتی ہے۔ دُرگا سے ہندوستانی میں ہی بات کی جائے۔ ہندوستانی لڑکی سے ہندوستانی زبان میں ہی بات کرنی چاہیئے۔

جب دُرگا قریب سے گزرنے لگی تو انور ذرا سا کھنکارا۔ ہندوستانی لڑکی نے گردن موڑے بنا ہی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر اس طرف دیکھا۔ انور نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ ہندوستانی لڑکی کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا اور چال اُکھڑ سی گئی جیسے انور نے سلام کی جگہ درگا کو گالی دی ہو۔ انور نے دُرگا کا تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس آگیا۔ دوسرے روز وہ مندر جانے کی بجائے کالی گھاٹ کے موڑ پر وہیں بانسوں کے جھُنڈ تلے پتھر پر بیٹھا دُرگاوتی کی راہ دیکھنے لگا۔ اس روز پھر انور نے دُرگا کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ پہلے روز تو دُرگا نے نظریں گھما کر دیکھ لیا تھا مگر آج اُس نے انور کو دیکھا تک نہیں۔ یعنی آج وہ پہلے سے زیادہ دیکھ رہی تھی۔ پہلے سے زیادہ انور کے پرنام کا جواب دے رہی تھی۔ اور پہلے سے زیادہ انور کی موجودگی کو محسوس کر رہی تھی! اسی طرح جب چار

پانچ روز محض پرنام کرتے گزر گئے تو انور کا پنجابی دل بے قرار ہو گیا۔ اس نے چھٹے روز درگا کا تعاقب کر کے اس کے گھر کا پتہ لگا لیا۔

دُرگاوتی چندر نگر کے ایک معمولی سکول ماسٹر کی لڑکی تھی۔ اُن کا گھر سٹیشن سے دریا کی طرف جانے والی سڑک کے پہلو میں ایک تنگ گلی میں واقع تھا۔ مکان کیا تھا۔ بس دو کمروں والا ایک پُرانا کوارٹر تھا جس کے چھوٹے سے صحن کی دیواروں پر بارش کی وجہ سے کائی جم رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ رتن جو کے گملے رکھے تھے۔ دونوں کمروں کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ جن میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور کھدر کا چھاپ دار پردہ گرا تھا۔ صحن میں ایک طرف رسوئی تھی جس کے پاس ہی دیوار کے ساتھ ایک تخت پوش بچھا تھا جس پر بیٹھ کر دُرگاوتی کی ماتا جی ترکاری وغیرہ بنایا کرتیں یا فرصت کے وقت چھالیہ کترا کرتیں۔ اس گھر میں دُرگاوتی کے ماں باپ کے علاوہ دُرگاوتی کا ایک چھوٹا بھائی بھی رہتا تھا۔ رِتو اس پانچ سالہ بچے کا نام تھا جو اسکول میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ انور نے دُرگاوتی کے باپ کے اسکول کا پتہ لگایا اور کسی نہ کسی طرح ماسٹر جی سے واقفیت پیدا کر لی۔ انور نے ماسٹر جی کی ایک تصویر بھی بنائی۔ جب ماسٹر جی نے اپنے چھوٹے لڑکے رِتو کی شرارتوں کا ذکر کیا تو انور اس جنگلی بلّے کی طرح جھپٹا جو دیر سے اپنے شکار کی تاک میں بیٹھا ہو۔ اس نے فوراً خواہش ظاہر کی کہ وہ رِتو کی بھی ایک تصویر بنائے گا۔

اس طرح ایک شام انور ماسٹر جی کے ساتھ دُرگاوتی کے گھر میں داخل ہوا۔ انور نے جب دُرگاوتی کو پرنام کیا تو وہ حیران سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے مندر سے گھر تک کے راستے میں بانس کے جھُنڈ میں بیٹھ کر پرنام کرنے والے لڑکے کو فوراً پہچان لیا اور سمجھ گئی کہ اُسے صرف دُرگاوتی کی کشش اس کے گھر تک کھینچ لائی ہے۔ درگاوتی کو اپنے آپ پر کچھ فخر بھی محسوس ہوا اور کچھ شرم بھی آئی کہ ایک ناواقف مرد اس کی محبّت کا دم بھرنے لگا ہے۔ درگاوتی کی ماتا جی نے

انور کو بیٹھنے کے لیئے چوکی دی۔ مگر ماسٹر جی اُسے اندر کمرے میں لے گئے۔ جہاں رِتو پلنگ پر بیٹھا ڈبیوں کا گھر بنا رہا تھا۔ کالا کالا سا بڑا ہی معصوم بچّہ تھا جیسا کہ عام طور پر بنگالی لڑکے ہوا کرتے ہیں۔ انور نے اُسے کھانے کے لیے جیب سے چاکلیٹ دیئے۔ (تجربہ کار شکاری کی طرح وہ اپنے جھولے میں اس قسم کے سب ہتھیار ساتھ لے گیا تھا) ماتا جی نے انور کے لئے چائے بنائی۔ چائے کا ٹرے درگاوتی اندر لائی۔ میز پر ٹرے رکھ کر اُس نے ساڑھی کا پلّو سر پر ٹھیک کیا اور اپنے پتا جی اور انور کے لئے چائے بنانے لگی۔ انور نے کہا۔ "چینی ایک چمچ ——" درگاوتی کے ہاتھ میں چمچ کانپنے لگا۔ بھولی بنگالی لڑکی انور کے اس جذبے کو بڑی اہمیت دے بیٹھی تھی کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ اُسے اس بات کی خبر تک نہ تھی کہ انور کو اس میں کیا چیز پسند آئی ہے اور یہ کہ وہ محبت وغیرہ کا قائل ہی نہیں۔

اب انور نے رِتو کی تصویر بنانا شروع کر دی۔ وہ جان بوجھ کر تصویر کے کام کو طول دے رہا تھا۔ اس نے رِتو کے کتنے ہی پنسل سکیچ بنا بنا کر ضائع کر دیئے۔ اس دوران میں وہ بلا ناغہ ہر روز شام کو درگاوتی کے گھر آتا رِتو کو پلنگ پر روشنی کے رُخ پر بٹھلا دیتا۔ رِتو کھلونوں اور ڈبے ڈبیوں سے کھیلتا رہتا اور انور جلدی جلدی سکیچ بناتا رہتا۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ درگاوتی کو کمرے سے رسوئی میں اور رسوئی سے صحن میں آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی درگاوتی بھی اُسے نگاہیں چرا کر دیکھ لیتی۔ دونوں کی نگاہیں ملتیں تو دونوں پر ایک دوسرے کے چور اور مکار ہونے کا راز کھل جاتا اور دونوں ہی شرمندہ سے ہو کر نظریں جھکا لیتے۔ یہ کنبہ بڑے سیدھے سادے شریف لوگوں کا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص دوسرے شہر سے اُن کے گھر میں آ کر انہیں دھوکا دے سکتا ہے۔ دراصل انور انہیں دھوکا دینا چاہتا بھی نہیں تھا۔ انور اتنا گھٹیا یا یوں کہہ لیجیے کہ اتنا دنیادار

انی نہیں تھا۔ اُسے درگاوتی اچھی لگی تھی اور وہ کچھ وقت اس پُراسراری سیدھی سادی اُداس غیر دلچسپ سپاٹ اور خالصتاً بنگالی لڑکی کی صحبت میں بسر کرنا چاہتا تھا۔ دُرگاوتی پورے بنگالی کلچر، بنگالی تہذیب اور بنگالی مزاج کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس ایک نقطے میں انور کو بنگال کی تمام خصوصیات اکٹھی مل گئی تھیں۔ اس ایک آواز میں انور کو بنگال کی تمام آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رکشا کھینچنے والے ہانپتے ہوئے بنگالی کے سانس کی آواز، فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے والی بڑھیا کی آواز، دوپہر کی اُداس فضا میں ساکن تالاب میں گاگر کے ڈبکیاں کھانے کی آواز، بوجھل شام کے سایوں میں گھروں کو لوٹتی گایوں کی گھنٹیوں کی آواز اور چاندنی رات میں مچھلیوں کے شکار میں نکلے ہوئے نیند کے مارے، بھوک کے مارے مانجھیوں کی درد بھری، نیند بھری آواز ——

درگاوتی بنگال کے تاڑ کی شاخوں میں لگا ہوا تاڑی کا پھل تھا جس کا رس تیز دوپہر کی حدت میں اندر ہی اندر پک رہا تھا اور ہلکی ہلکی نشہ آور خوشبو چھوڑ رہا تھا۔ انور پر اس خوشبو نے جادو سا کر دیا تھا۔ وہ سرپھرے بھونرے کی طرح تاڑی کے اس سخت پھل کے اردگرد چکر لگا رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس جگہ اپنا منہ رکھے اور کس جگہ اپنی آنکھیں؟

وہ درگاوتی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ درگاوتی کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ درگاوتی کی یاد میں آہیں نہیں بھرنا چاہتا تھا۔ نہ وہ یہ چاہتا تھا —— کہ درگاوتی اس کی یاد میں آہیں بھرے۔ وہ درگاوتی کو اغوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ درگاوتی کو اس قسم کا معمولی سا احساس بھی نہیں دلانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اُسے ہمیشہ یاد رکھے گا۔ وہ درگاوتی کو پسند کرتا تھا۔ اُسے درگاوتی کے محور پر پورا بنگال گردش کھاتا نظر آ رہا تھا۔ اور وہ گھر سے بنگال کو دیکھنے بنگال کو سونگھنے اور بنگال کو ہاتھ لگا کر محسوس کرنے نکلا تھا جس طرح بمبئی کی گھاٹن مکھیا میں اُسے پورے

مہاراشٹر کی ایک بھرپور جھلک دکھائی دی تھی اسی طرح اُسے درگاوتی کے رُوپ کے گرد بنگال کا ایک ایک ذرّہ چمکتا، ٹمٹاتا، رقص کرتا نظر آرہا تھا۔ وہ درگاوتی کو زیادہ سے زیادہ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب ہونا چاہتا تھا۔ لیکن ہندوستانی عورت جب کسی مرد کے زیادہ سے زیادہ قریب آتی ہے تو پھر اُسے زیادہ سے زیادہ اپنے قریب ہی رکھتی ہے۔ وہ اُسے اپنے چنگل میں اس بُری طرح سے پھنسا لیتی ہے کہ مرد لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر اس تیندوے کے جال سے باہر نکل ہی نہیں سکتا۔ وہ پورے سمندر کی جھلک دکھا کر مرد کو اپنے کنوئیں میں ہمیشہ کے لیئے بند کر لیتی ہے۔ وہ کسی مرد کو پسند کرتی ہے تو اس سے محبت کرنے لگ جاتی ہے۔ محبت کرتی ہے تو شادی ضرور کرتی ہے اور جب شادی کر لیتی ہے تو کم از کم ایک درجن بچے ضرور پیدا کرتی ہے اور جب ایک بار بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر محبت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ پھر وہ ماں بن کر اپنے بچوں اور اپنے خاوند کی دیکھ بھال شروع کر دیتی ہے۔ مرد عورت سمجھ کر اس کے پاس جاتا ہے اور وہ ماں بن کر اُسے سینے سے لگا لیتی ہے۔ اس کی محبت شادی پر اور شادی موت پر ختم ہوتی ہے اس کی محبت شادی کا بچپنہ اور شادی موت کی جوانی ہے اور اسی طرح یہ ایک ایسا موت کا چکر چلتا ہے جس میں جذبات، فلسفہ، گیان، یوگ، بھگتی، مکتی، آرٹ، ادب اور فن کے تمام نظریے خاک کے ذرّے بن کر اُڑتے نظر آتے ہیں۔ انور محبت اور عورت کے انجام سے پوری طرح باخبر تھا۔ اسی لئے وہ بہت محتاط تھا۔

لیکن درگاوتی ہندوستانی اور سب سے بڑھ کر بنگالی عورت تھی۔ پنجابی عورت شادی کے کچھ عرصہ بعد تک پھر بھی عورت رہتی ہے۔ مگر بنگالی عورت شادی کے دوسرے ہی دن ماں بن جاتی ہے۔ پھر آپ لاکھ ماریں پیٹیں، اس کے منہ سے ماں کی دعاؤں کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا۔ یہ بنگالی عورت کی سرشت ہے اور اسی سرشت سے انور خائف تھا۔ وہ عورت کو ہر روپ میں دیکھنے پر راضی تھا مگر غیر عورت کے روپ میں کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ درگاوتی کے کردار میں بنگالی کردار کی حقیقی سرشت کام کر رہی تھی۔ جب سے انور اس کے گھر اس کے بھائی رتو کی تصویر بنانے آنا شروع ہوا تھا درگاوتی نے اندر ہی اندر انور سے محبت کرنا شروع کر دی تھی۔ لیکن اُس نے اس محبت کو ایک خاص مقام سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ انور ایک تو بنگالی نہیں دوسرے مسلمان ہے۔ اس کی حالت بالکل اس کوچوان کی سی تھی جو میدان کے بیچ میں کھڑا منہ زور گھوڑے کو رسی سے باندھے دائرے کی شکل میں دوڑا رہا ہو۔

درگاوتی نے اپنے جذبات کے گھوڑے کو ایک چکر میں ڈال دیا تھا اور خود رسی تھامے بڑے آرام سے بیچ میں کھڑی تھی۔ وہ محبت کے خوابوں سے لذت یاب بھی ہو رہی تھی۔ اور اس کے صاف نظر آتے خوفناک انجام سے توبہ بھی کر رہی تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ انور کا تصوّر اُسے وقت بے وقت پریشان کرنے لگا تھا۔ مندر میں دیوی کی پوجا کرتے سمے وہ دیکھتی کہ انور دیوی کے کے پاس کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ وہ فوراً آنکھیں بند کر لیتی اور ہری اوم کا جپ شروع کر دیتی۔ وہ اس تصوّر کو پسند بھی کرتی تھی اور اس سے پیچھا بھی چھڑانا چاہتی تھی۔ پسند اس لئے کرتی تھی کہ اُسے انور پسند تھا اور پیچھا اس لئے چھڑانا چاہتی تھی کہ انور اُسے کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ یعنی وہ انور سے کبھی شادی نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی بچے پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی اُسے اپنے ساتھ شادی کے کنوئیں میں بند نہیں کر سکتی تھی۔ اس اعتبار سے درگاوتی بدقسمت تھی اور انور خوش قسمت تھا۔

درگاوتی اتنا ضرور چاہتی تھی کہ انور کسی روز کسی وقت جب وہ کمرے میں اکیلے ہوں یا جب وہ ایسا آسانی سے کر سکے تو اس کا دامن ہولے سے ضرور کھینچے۔ آہستہ سے اس کا نام لے کر پکارے۔ جب وہ قریب سے گزرنے لگے تو اُسے چپکے سے بازو سے تھام لے اور اس کا چہرہ تھام کر کہے۔

"درگاوتی! درگاوتی! مجھے تم سے پریم

ہوگیا ہے ری!"

ہائے رام! درگاوتی شرم سے لال ہوگئی۔ وہ پانی کے نل پر گڑوی بھر رہی تھی۔ انور اندر اس کے پتا جی کے پاس بیٹھا انہیں رتو کی مکمل شدہ تصویر دکھا رہا تھا۔ وہ کنکھیوں سے کتنی ہی دیر انور کو دیکھتی رہی۔ آج پہلی بار وہ اس اجنبی کو اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسا کہ حساس آدمیوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر لیتے ہیں۔ انور نے نگاہیں اٹھا کر درگاوتی کو دیکھا درگاوتی نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ گڑوی اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ رسوئی سے ماتا جی نے آواز دی۔ درگاوتی "آئی ماں جی" کہہ کر جلدی سے رسوئی کی طرف بھاگ گئی۔

انور بھی درگاوتی کی شخصیت میں اس عظیم تبدیلی کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا مگر وہ کسی طرح بھی درگا کو اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے محبت کئے جانے والی محبت کرتا ہی نہیں تھا۔ دو ایک بار انور کو کمرے میں درگاوتی کے ساتھ تنہائی کا موقع بھی ملا۔ مگر وہ درگا پر ایک بھرپور نظر ڈال کر خاموش ہو رہا۔ اس کی تلاطم پسند طبیعت کو جانے یہ سکون کہاں سے مل گیا تھا۔ اس نے خلافِ معمول آج تک درگاوتی کے جسم کا جستہ جستہ جائزہ نہ لیا تھا۔ ———————— ۔ وہ درگاوتی کی چھاتیوں، اس کے پیٹ، اس کے ہونٹوں، آنکھوں، رخساروں، کولہوں اور پنڈلیوں کو اس کے جسم سے الگ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ درگاوتی ایک مجسم روپ تھا ایک مکمل کُل تھا جس میں اس کا ہر جزو گھل مل گیا۔ اتنی بھرپور اتنی مکمل اور اتنی مجتمع عورت انور پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس سیاہ ہرن کے جسم میں کہیں نہ کہیں وہ پھول ضرور اُگا ہوا ہے جو نسوانی خوبصورتی اور جنسی تقدس کی حیرت انگیز مہک اُڑا رہا ہے۔ اسی پھول کی تلاش، اسی مہک کی جستجو اُسے درگاوتی کی طرف کھینچ لائی تھی۔ وہ اس پھول کی خوشبو کے ساتھ ساتھ سرزمینِ بنگال کی سرحدیں توڑ کر خلیج بنگال کے سیاہ پانیوں میں بھی اُتر سکتا تھا۔

درگاوتی حیران تھی کہ تنہائی کے لمحے میسر آنے پر بھی انور اس سے اظہارِ محبت کیوں نہیں کرتا۔ وہ چاہتی تھی کہ جب کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہ ہو تو

وہ کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے کہے۔

"درگا! میں تم سے پریم کرتا ہوں۔"

اور وہ اس کے ہونٹوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہے۔

"چھی! ایسی باتیں نہیں کرتے بابو!"

اور اس کا جی چاہے کہ انور اُسے بار بار کہے۔ درگا! میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ درگا میں تم سے پریم کرتا ہوں، اور زبان سے اُسے کہتی جائے۔ چھی! ایسی باتیں نہیں کرتے بابو! لیکن دل بار بار کہتا رہے۔ ایک بار پھر کہو، ایک بار پھر کہو۔ مگر انور نے ایک بار بھی اُسے نہیں کہا تھا کہ درگاوتی میں تم سے پریم کرتا ہوں اور انور درگاوتی سے ایسا پریم کرتا بھی نہیں تھا جس کی خاطر اُسے سجے سجائے کمروں میں بیٹھ کر محبت کرنے والوں کی طرح اظہارِ عشق کی ضرورت محسوس ہوتی۔

درگا پوجا کا تہوار آیا تو شہر کے مندروں میں بڑا چراغاں ہوا۔

چراغوں اور بجلی کے قمقموں کی ڈیوٹ مالا سے مندروں کے کلس دروازے اور ڈیوڑھیاں جگمگا اُٹھیں۔ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہر بنگالی گھر میں رس گلے، بتاشے اور سفید چاولوں کی کھیر تیار ہونے لگی۔ بنگالی عورتیں رنگ برنگی ساڑھیاں پہن کر پوجا کے پھل اور پھول ساتھ لے کر مندروں کی سمت چل پڑیں۔ ماسٹر جی کے گھر میں بھی اس روز بڑی رونق تھی۔ رتو اور درگا نے نئے کپڑے پہنے۔ درگا کی ماتا جی نے صبح صبح ہی اُٹھ کر کھیر بنالی۔ درگا نے ماتا کا ہاتھ بٹایا۔ سارا دن گھر پر سادھو سنتوں کو کھانا کھلانے کے بعد یہ لوگ شام کو مندر چلے گئے۔ انور بھی ان کے ساتھ ہی مندر گیا۔ درگا کا کنبہ انور کی اس بات پر حیران بھی تھا اور خوش بھی کہ وہ مسلمان ہو کر اس طرح اُن کی مذہبی رسموں میں حصہ لیتا ہے۔ درگا کی ماتا جی کو یقین تھا کہ وہ اگر انور کو ایک سال تک اپنے گھر میں رکھیں تو وہ ضرور ہندو ہو جائے گا۔

حالانکہ انور ان باتوں سے کوسوں دُور تھا۔ وہ ہندو بھی تھا اور مسلمان بھی اور نہ ہندو تھا اور نہ مسلمان۔ اس روز انور نے بھی ماتھے پر تلک لگایا اور درگا دیوی کے

پتروں میں پوجا کے پھول ارپن کئے۔ مندر میں عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کا بہت ہجوم تھا اور بھجنوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مندر کے عقب میں ایک چھوٹی سی کٹیا تھی جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں رام جی اپنے بن باس کے دنوں میں کچھ روز ٹھہرے تھے۔ درگا انور کو وہ کٹیا دکھانے کے لئے لے گئی۔ وہاں دوسرے لوگ بھی جمع تھے اور معمر عورتیں اور بوڑھے مرد زیر لب اشلوک پڑھتے ہوئے کٹیا کے پوتر استھان کے درشن کر رہے تھے۔ انور کو اس کٹیا میں کوئی انوکھی بات نظر نہ آئی۔ پھر بھی وہ درگا وتی کے لئے بڑی دلچسپی سے ہر بات کو دیکھتا رہا۔ واپسی پر جب وہ کیلے کے باغ میں سے گزر کر بڑے مندر کی طرف جانے لگے۔ تو اچانک ایک جگہ انور نے درگا وتی کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

"درگا! ——— دیوی درگا!......"

درگا وتی تو سُن ہو کر رہ گئی۔ اُسے وہم و گمان تک نہ تھا کہ انور ایک روز اتنی جرأت سے بھی کام لے سکتا ہے۔ انور نے جب اس کی کلائی پکڑی تو اس کی چوڑیاں بج اُٹھیں اس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا اور کان کی لویں گرم ہو کر دہکنے لگیں۔ اس کی زبان پر تالا سا پڑ گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے اور آواز کہیں دُور حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ دونوں مندر کی پچھلی دیوار کے سائے میں کھڑے تھے اور ان کے اردگرد کوئی نہیں تھا۔ انور جیسے خواب میں کہہ رہا تھا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ میں تم سے پریم کرتا ہوں دُرگا! نہ میں اس بات کی قسم کھا سکتا ہوں کہ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا مگر اتنی بات ضرور ہے کہ زندگی میں پہلی بار مجھے عورت کے وجود کی اہمیت اور اس کے خلا کا احساس ہوا ہے تم نے پہلی بار مجھے ایک انوکھی بات سے دوچار کیا ہے۔ وُہ بات یہ ہے کہ اگر عورت نہ ہو تو کیا ہوتا ہے۔ اور اگر ہو تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ میں

تمہیں دن بھر دیکھتا ہوں۔ تم سارا دن میرے سامنے ہوتی ہو اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم مجھ سے لاکھوں میل دُور ہو۔ میں اگر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی تمہاری تلاش میں نکلوں تو تمہیں نہیں پا سکتا اور جب میں تم سے جُدا ہوتا ہوں تو تم سے دُور ہوٹل میں بیٹھا ہوتا ہوں اور تم میرے پاس نہیں ہوتیں تو یوں لگتا ہے، جیسے تم میرے انتہائی قریب ہو اور میں ذرا سا ہاتھ بڑھا کر تمہیں چھو سکتا ہوں۔ تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام سکتا ہوں۔ یہ کیا ہے درگا وتی؟ تم اسے پریم کہتی ہو تو میں تمہارا پریمی ہوں۔ تم اُسے دیوانہ پن سمجھتی ہو تو میں تمہارا دیوانہ ہوں......"

انور بولے جا رہا تھا اور درگا وتی چپ چاپ کھڑی زمین کو تک رہی تھی۔ نہ وہ زبان سے کچھ بول رہی تھی اور نہ اس نے انور کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ انور کی آواز میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ بھرپور اعتماد بھی کار فرما تھا۔ وہ بڑے سکون اور ملائمت کے ساتھ اُسے اپنے دل کے گہرے اسرار بتا رہا تھا۔ جس طرح پُرانے مقبروں کا محافظ سیاح کو مقبرے کے تاریخی پس منظر سے آگاہ کر رہا ہو۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ جذبات کے دھارے میں الفاظ کی کنکریاں اُچھل اُچھل کر بہے جا رہی تھیں۔

"میں جانتا ہوں تمہارے دل میں بھی اسی طوفان کی لہریں موجزن ہیں۔ تم بھی اپنے

مَن مندر کی چار دیواری میں آنکھیں بند کئے بیٹھی
اِن ہی مقدس بھجنوں کے اشلوک سُن رہی ہو
اس لئے کہ ہم ایک ہی سمندر کی دو مختلف
لہریں ہیں۔ ایک ہی سیپ کے دو انمول
موتی ہیں جس ڈالی پر میں کانٹا بن کر پھوٹا ہوں
اسی ڈالی پر تم پھول بن کر کھل رہی ہو۔ وقت
کی آندھی اور زندگی کی ان گنت صدیوں
کے بعد دو ذرّوں کو ایک حیرت انگیز اتفاق
سے ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا
ہے۔ ان دونوں ذرّوں کا ملاپ کچھ دیر کا
ہے۔ جس اصول نے اُسے ملایا ہے وہی
اصول انہیں ایک بار پھر جدا کر دے گا ——
ان گنت صدیوں کے لئے، لا محدود زمانے
کے لئے کیا ہم اس تھوڑے سے وقفے میں
جو قدرت نے کمال فیاضی سے ہمیں کروڑوں
سال کی جدائی کے بھنڈار میں سے دان کیا
ہے ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی
نہیں بولیں گے؟ وصال اور جدائی کے
سنگم پر کیا ہماری زبانیں انتہائی خوشی اور انتہائی
ملال سے بند رہیں گی۔ بولو —— دُرگا
—— کچھ تو بولو —— کیا مجھے یاد کیا کرو
گی؟"

اب دُرگا وتی کی آنکھوں میں آنسو اُبل رہے تھے۔ گہری گھاٹیوں کی نچان میں

پوتر پانیوں کے مقدّس چشموں میں طوفان اُمڈ آیا تھا۔ اس کا سارا بدن لرزنے لگا تھا اور وہ بے اختیار رونے لگی تھی۔ انور نے درگاوتی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جیب سے سفید رومال نکالا اور درگا کے آنسو پُونچھے۔ درگاوتی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ انور نے آہستہ سے درگا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ انور سے لپٹ گئی اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ یوں رو رہی تھی جیسے مدّتوں کے بچھڑے مِل رہے ہوں۔ درگاوتی کی ریشمی ساڑھی، تنے ہوئے سانولے کنوارے بدن اور سیاہ بالوں میں سے سحر انگیز ملی جُلی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔ انور نے درگاوتی کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے درگاوتی کے لب پھول کی پنکھڑیوں کی مانند کانپ رہے تھے۔ انور کو یوں لگا جیسے اُس نے سیاہ ہرن کے نافے کا منہ کھول دیا ہو۔ اس کے چاروں طرف خوشبو، رنگ سحر، طلوع، غروب، وصال، آواز، موتی اور قوس قزح کے ذرّات رقص کر رہے تھے۔ خلا مذہبی موسیقی کی دلنواز ہیبت ناک تانوں سے بھر گئی تھی اور ان بھجنوں کی گونج سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ لرزہ براندام تھا۔ انور کی حالت بالکل اس ہندو بچے کی سی ہو رہی تھی جس کے سامنے بھگوان کرشن ظاہر ہو گئے ہوں اور وہ خوشی اور ہیبت سے کانپ رہا ہو۔

اچانک مندر کی طرف سے پجاریوں کی جے جے کار بلند ہوئی اور ان دونوں کا خواب ٹوٹ گیا۔ درگاوتی نے جلدی سے اپنی ساڑھی کو درست کیا اور پلّو سے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

انور وہاں اکیلا رہ گیا۔ اس کے پاس اندھیرے میں کیلے کا ایک درخت خاموش کھڑا تھا۔ انور کے ماتھے پر رام نام کا تلک تھا اور مندر کی طرف سے آنے والے پجاریوں کی آوازوں میں اب عورتوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں انور کے ہاتھ میں سفید رومال تھا جس سے اس نے دُرگاوتی کے درد کے آنسو پونچھے تھے۔ وہ رومال کو یوں احتیاط سے تھامے ہوئے تھا جیسے اس میں تختِ طاؤس کے ہیروں سے بھی زیادہ قیمتی موتی بندھے ہوئے ہوں۔ اس نے رومال کو چوم لیا۔

اس میں سے گیندے اور مہاگنی کے پھولوں کی گہری گہری جادو بھری پُراسرار خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

دو چار روز انور درگاوتی کے گھر نہ گیا۔

وہ جان بوجھ کر درگا سے دُور رہنا چاہتا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں چار نہ کر سکیں گے۔ ایک روز جب وہ درگاوتی کے ہاں گیا تو ماسٹر جی نے انور کو مٹھائی کھلائی اور بتایا کہ درگا کا اگلے مہینے بیاہ ہو رہا ہے۔ انور نے بڑے سکون سے یہ خبر سنی اور وہاں بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ آج درگا اس کے سامنے نہیں آ رہی تھی۔ دو ایک بار اس کے سامنے سے گزری بھی تو اُس نے گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ انور نے درگاوتی کے ماتا پتا کو مبارک باد دی اور اُٹھ کر چلا آیا۔ دوسرے مہینے درگاوتی کا کلکتے والے اکشے کمار سے بیاہ ہو گیا۔ یہ سارا مہینہ انور نے چندر نگر کی آوارہ گردی اور ایک عجیب طوفانی موڈ میں بسر کیا۔ اس دوران میں وہ درگا کے گھر دو ایک مرتبہ ہی گیا اور اس دوران میں بھی وہ درگا دیوی کے درشن نہ کر سکا۔ صرف ایک بار اُس نے درگا دیوی کو دیکھا۔ وہ باہر دالان میں بیٹھا اس کے باپ سے باتیں کر رہا تھا۔ اور کواڑ کے پیچھے کھڑی درگاوتی اُسے پتھریلی نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ انور کو یہ منجمد نگاہیں برف کی قاشیں بن کر اپنے دل میں اُترتی محسوس ہوئیں اور وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

اپنی مرضی کے خلاف محض درگاوتی کے پتا جی کی خواہش کے احترام میں انور برات کی رخصتی کے وقت وہاں موجود تھا۔ درگاوتی دلہن بنی گہنے پاتے سے لدی اپنے خاوند کے ساتھ لگن منڈپ میں بیٹھی تھی اور برہمن آگ میں گھی اور چاول ڈالتے ہوئے اشلوک پڑھ رہے تھے۔ انور کو ان کی آوازوں پر ماتمی آوازوں کا گمان ہو رہا تھا۔ درگا کو سولہ سنگار سے آراستہ کیا گیا تھا لیکن اس کا چہرہ لاش کی طرح بے حس اور بے جان تھا۔ درگاوتی رخصت ہو گئی۔ اپنے ماں باپ کو روتا چھوڑ کر، خود بھی روتے ہوئے چلی گئی۔ اُس نے آخری بار گاڑی میں دُلہا کے ساتھ سوار ہوتے ہوئے انور

کو دیکھا۔ انور نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ نمسکار دیوی! الوداع درگا! زندگی کا چکر ایک بار پھر ہمیں جدا کر رہا ہے۔ کروڑوں سالوں کی جدائی اور ایک پل کے ملاپ کے بعد کروڑوں سالوں کے لئے دو ذرّے بچھڑ رہے ہیں۔ خدا حافظ! جنم جنم کے ہنگاموں، جنم جنم کی خوشیوں غمیوں میں کبھی کبھی ہمیں بھی یاد کر لیا کرنا۔ لاکھوں جنموں کے بعد ایک جنم ایسا بھی آئے گا جب ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ پھر زندگی کا چکر صرف ہمارے ملاپ کے لئے چلے گا۔ پھر کوئی اکشے کمار کلکتے سے آ کر تمہیں مجھ سے چھین کر نہیں لے جائے گا۔ پھر جو لگن منڈپ سجے گا اس میں مَیں اکشے کمار ہوں گا اور تم درگاوتی ـــــ ابھی کچھ دنوں کے لئے، کچھ کروڑ سالوں کے لئے، کچھ اَن گنت جنموں کے لیے رخصت درگاوتی! درگا دیوی!....

اسی رات انور نے اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بند کیا اور کینوس ایزل پر لگایا۔ درگا کے پُرانے سکیچ سامنے رکھے اور تصویر بنانا شروع کر دی۔ یہ پہلی تصویر تھی جسے بناتے ہوئے انور نے اپنے کپڑے بالکل نہ اُتارے۔ رات بھر وہ تصویر بناتا رہا۔ بعد ازاں جب اس نے لاہور میں یہ تصویر نمائش میں رکھی تو لوگوں نے اس تصویر کو بے معنی قرار دیا۔ حالانکہ انور کے نزدیک یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی تصویر تھی۔ اس تصویر میں جو کہ آئل پینٹنگ تھی انور نے سبز بیک گراؤنڈ کے ساتھ گیروے رنگ کے محراب کے سامنے سیاہ رنگ میں ایک عریاں عورت کو تپسیا کرتے ہوئے دکھایا تھا۔ ایک سُرخ لکیر نے اس عورت کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ سُرخ لکیر زخم سے مشابہ تھی۔ اس تصویر کا نام "بنگالی لڑکی" تھا۔

بنگالی لڑکی کی تصویر ساتھ لئے انور لاہور آ گیا۔

اس کے بعد دو ایک بار اُسے کلکتے جانے کا اتفاق ہوا مگر درگاوتی سے اس کی ملاقات پھر نہ ہو سکی۔ انور نے بھی چندر نگر جا کر اُسے ملنے کی کوشش نہ کی۔ ایک بار بچھڑ کر دوبارہ ملنے کے جتن کرنا اُسے گوارا نہیں تھا۔ اگر جُدا ہونے کے بعد کسی کے پیچھے مارے مارے پھرنا ہے تو پھر جُدا ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے بھی دنیا میں ہر روز بلکہ اس پوری کائنات میں ہر گھڑی، ہر پل، ہر پل کے ہزارویں حصے میں کوئی نہ کوئی شے کسی نہ کسی شے سے جدا ہو جاتی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

یہ جدائی زندگی کی اصل حقیقت ہے اور اسی حقیقت پر اس کائنات کی اساس رکھی گئی ہے۔ دھرتی سورج سے جُدا نہ ہوتی تو درگاوتی ایسی دلگداز لڑکی کبھی جنم نہ لیتی۔ اگر چاند دھرتی سے جدا نہ ہوتا تو دنیا رنگ برنگے رس بھرے شیریں پھلوں اور خوشبو دار پھولوں سے محروم رہتی۔ اگر جدائی نہ ہوتی تو وصال ایک عذاب بن جاتا۔ دلی والے میرزا جی نے اسی لئے تو کہا تھا۔

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لاہور میں آ کر انور اپنے فن سے متعلق مصروفیات میں الجھ گیا۔ لاہور جو ادب و آرٹ کا مرکز ہے اور جس کی سڑکیں فنکاروں کے لیے اپنا دامن ہمیشہ کھلا رکھتی ہیں۔ یہاں انور کے دوستوں کا حلقہ اچھا خاصہ تھا۔ اس نے پینٹنگ میں باقاعدہ فنی تعلیم حاصل

کرنے کی غرض سے نیشنل کالج آف آرٹس میں داخلہ لے لیا اور فالتو وقت میں کتابوں کے سرورق پبلسٹی کے شو کارڈ اور سینما سلائیڈیں بنانا شروع کر دی۔ اس طرح اُسے جو پیسے ملتے وہ اس کے گذارے کے لئے بہت تھے وہ اکیلا آدمی تھا میکلوڈ روڈ کی ایک بلڈنگ میں ایک کمرہ بیس روپے ماہوار پر لے رکھا تھا۔ صبح کالج آتا۔ کالج سے گھر جاتا۔ کمرہ بند کر کے لوگوں کے کام کرتا۔ تیسرے پہر مال روڈ پر آ جاتا اور ہوٹلوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے اڑاتا اور دنیا جہاں کے موضوعات پر باتیں کرتا۔

الفردوس ٹی شاپ انور کا خاص ٹھکانہ تھا۔ اس ہوٹل میں رات گئے تک محفلیں جمی رہتیں۔ الفردوس میں ادب کے نقاد، شاعر، افسانہ نگار، آرٹسٹ، آرٹ کے نقاد ادب اور آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے سیاستدان اور وکیل، سبھی آ کر بیٹھتے تھے۔ افسانہ ناول، شعر اور فنِ تنقید پر لمبی لمبی بحثیں ہوتیں۔ طویل مقالے لکھنے کا پروگرام بنایا جاتا زیر تحریر ناولوں اور کہانیوں پر گفت و شنید ہوتی۔ کسی کے سر پر تاج رکھا جاتا۔ کسی کی پگڑی اچھالی جاتی۔ ان لوگوں کی الگ الگ ٹکڑیاں تھیں۔ ایک ٹکڑی والے پرانے ادب کے حامی تھے اور ادب میں نئے تجربوں کی مخالفت کرتے۔ دوسری ٹولی نئی پود کی حمایت اور ہر لحظہ شکوہ کناں رہتی کہ پرانے لوگوں نے گدیوں پر قبضہ جما رکھا ہے اور نئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا رہی۔ تیسری ٹولی والے نئے اور پرانے دونوں کو دھر رگڑتے اور دونوں کی مخالفت کرتے۔ ان کے خیال میں دونوں طرح کے لوگ ادب اور فن کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں جذبۂ رقابت رکھ کر فن کی دشوار گزار راہوں پر چل رہے تھے چوتھی ٹکڑی ان لوگوں پر مشتمل تھی جو ادب میں مذہب پرستی کے قائل تھے اور ملحدانہ نظریات کی تبلیغ کو ادب اور انسانیت کے لئے مہلک قرار دیئے ہوئے تھے۔

انور کا گروہ نراجیوں کا گروہ تھا۔ یہ لوگ ادب اور فن میں کسی بھی اخلاقی، مذہبی اور سیاسی نظریے کے قائل نہ تھے۔ پال گوگین اور ایمل زولا کی طرح یہ ادب پرست اور زندگی پرست تھے۔ مذہب کو ان لوگوں نے ادب اور فن سے الگ کر رکھا تھا۔

کچھ لوگ مذہب کو مانتے ہی نہ تھے۔ نرم و نازک خدوخال اور چمکیلے بالوں والا سعید دہریہ تھا اور کسی مذہب پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ دُبلے پتلے ہاتھ سے سر کے لمبے بالوں کی لِٹ پیچھے ہٹا کر وہ زوردار آواز میں کہتا۔

"مذہب نے اپنا کردار ادا کر لیا ہے اب
انسانی ذہن اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ
اپنی بُرائی بھلائی کی بات خود سوچ سکے اور
اپنے لئے خود نئی راہیں متعین کر سکے۔
انسان غیر مذہبی پیدا ہوتا ہے۔ ہم لوگ
اس کے ماتھے پر تلک لگاتے ہیں۔ گلے
میں جینیو پہناتے ہیں۔ چہرے پر لمبی داڑھی
اگاتے ہیں اور کندھے پر صلیب رکھ کر اُسے
گرجے کی طرف روانہ کرتے ہیں۔ مذہب
کے نام پر انسانوں پر بڑے گھناؤنے
مظالم توڑے گئے ہیں۔ اب اس ایلیے
کو ختم کر دینا چاہیئے اب بہت ہو چکی ہے"

بھدے ہونٹوں، چوڑے چکلے بدن اور پھٹی ہوئی آواز والا یوسف صرف خدا کو مانتا تھا اور کسی شے پر اس کا ایمان نہیں تھا۔

"خدا ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ خدا
کو ہمارے چھوٹے چھوٹے مسائل اور گھریلو
باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ نہ ہندو
ہے نہ مسلمان اور نہ عیسائی۔ وہ مادے
کی رُوح ہے۔ روح کی اصل ہے اور
اصل کا ذہن ہے۔ خدا دو اور دو چار کا نام

ہے۔ ایک آدمی رات دن کی عبادت
سے اپنے ماتھے پر محراب ڈال سکتا ہے
مگر دو اور دو کو پانچ نہیں بنا سکتا کبھی نہیں
بنا سکتا۔"

یُوسف اپنے اسی نکتہ نظر کی روشنی میں نئی پود کے فن کاروں کی تخلیقات پر گزشتہ چار سال سے ایک طویل تحقیقاتی مقالہ سپردِ قلم کر رہا تھا۔ ایک بار اُسے دردِ گردہ کا شدید دورہ پڑا۔ ساری رات درد سے تڑپتا اور ماں ماں چلاتا رہا۔ دوسرے دن اس نے الفرڈی میں آکر اعلان کیا۔

"خدا کے بعد اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ ماں
ہے بس"

شک پسند ہمایوں نے کہا۔

"ماں حیاتیات کے ایک جدلیاتی رشتے کا
نام ہے۔ اگر تم اس کے گھر پیدا نہ ہوتے تو
وہ کبھی تم سے پیار نہ کرتی۔ یہ پیار انسانیت
کی رگوں میں خود غرضی اور خود پرستی کا زہر دوڑا
رہا ہے۔ ہماری ترقی کا راز صرف اس حقیقت
میں ہے کہ ہم ماں باپ اور اولاد کی محبت
سے بے نیاز ہو جائیں"

"بکواس بند کرو ہمایوں" عینک پوش
سبز آنکھوں اور خشک بالوں والا شاعر صبا چلا
کر کہتا "انسان ایک گھریلو جانور ہے۔ ہم نے
سالہا سال کی وحشی زندگی کی درندگیوں کے
بعد گھر کی محبت کا مقام حاصل کیا ہے۔ کیا

تم یہ چاہتے ہو کہ ہم ایک مرتبہ پھر جنگل
میں چلے جائیں۔ ایک دوسرے کا گوشت
نوچیں اور پیٹ کے بل لیٹ کر گندے
تالابوں کا پانی پئیں۔"

ہمایوں میز پر مکا مار کر چیختا ہے۔

"جنگل! آہ جنگل!
انسان کا ازلی اور ابدی گھر۔ کاش! ہم لوگ
جنگل سے کبھی باہر نہ آتے کمینے شاعر! تو
پھول پتوں کی تعریف میں شعر کیوں کہتا ہے؟!
اس حرامزادے سعید کلرک نے اپنے گھر کے
آنگن میں گملے کیوں سجا رکھے ہیں۔ یہ وہی جنگل
کی بازگشت ہے جو ہمارے سینوں میں ابھی
گونج رہی ہے۔ جو ہمارے دلوں میں ابھی
تک زندہ ہے۔ اور جسے ہم ہر قیمت پر زندہ
رکھے ہوئے ہیں جنگل ہمارا سب سے پہلا پیار
اور سب سے بڑا محسن ہے۔ ہمارے سب
سے بڑے دشمن ہماری اصلاح کرنے والے
تھے۔ جنہوں نے ہمیں جنگلوں سے نکال کر
پتھروں کی مردہ چار دیواری میں بند کر دیا ہے
کمینے! ادھر دیکھو۔ یہ میرے ہاتھ میں جلے
ہوئے دودھ اور جلی ہوئی سڑی ہوئی بھونی
ہوئی سیاہ پتیوں کی چائے ہے۔ اس چائے
نے ہم سبھوں کے کلیجے بھون ڈالے ہیں۔

اگر اس وقت ہم سنگل دیپ یا مالدیپ
یا سندربن کی گہری گھاٹیوں میں ہوتے اور
ہمارے جسموں پر سوائے درختوں کی چھال
کے اور کچھ نہ ہوتا تو ہمارے سامنے چائے
کی بجائے جانتے ہو کیا ہوتا؟"

ہمایوں کہتا۔

"شراب!"

"شٹ اپ! اس وقت ہمارے آگے
ناریل کے پیالوں میں پڑی ہوئی خوشبودار
میٹھی اور تر و تازہ تاڑی ہوتی۔"

یوسف اپنی پھٹی ہوئی آواز میں بولتا۔

"دوستو! میں نے سنا ہے یہاں انار کلی
میں کہیں تازہ تاڑی کا رس بکتا ہے۔ آج
شام تاڑی پی جائے۔"

سعید بڑی نزاکت سے رخساروں پر لمبی لمبی انگلیاں پھیرنے لگتا اور کہتا۔

"پہلے ہمیں اس بات کا یقین ہو جانا چاہیئے
کہ ہمارے معزز مقالہ نگار مسٹر یوسف چنگیزی
اپنے پُر مغز مقالے میں جسے وہ عرصہ چار
سال سے مکمل کرنے کی بے سُود کوشش
کر رہے ہیں۔ انار کلی کی تاڑی کا ذکرِ خیر بھی
ہو گا۔

اور محفل میں قہقہے بلند ہونے لگتے۔

انور ان سبھوں کا دوست تھا اور تقریباً ہر روز ان لوگوں سے ہوٹل الفردوس

میں ملاقات کرتا۔ لیکن اُس نے اپنے نظریات یا اعتقادات کی کبھی تبلیغ نہیں کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بڑی ذاتی چیزیں ہوتی ہیں اور ایک انسان کو دوسرے کے اعتقادات اور نظریات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھنی چاہیئے۔ اگر ایک شخص سڑک پر ہمیشہ بائیں ہاتھ کو چلتا ہے، سینما ہال میں سگریٹ نہیں پیتا۔ کسی لڑکی کو اغوا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا جھوٹی گواہی نہیں دیتا۔ دکاندار کو کھوٹا سکہ نہیں دیتا۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت کرتا ہے اور بیوی کے حقوق کا خیال رکھتا ہے اور کبھی ننگا گھر سے باہر نہیں نکلتا تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم اس سے پوچھتے پھریں۔ کیوں صاحب! آپ خدا پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟ کیا ہم ایسے شخص کو محض اس لئے قتل کر دیں گے کہ وہ خدا کو نہیں مانتا اور مذہب کو ایک پرانی چیز سمجھتا ہے۔

ویسے بھی انور کو اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے مسجد میں داخل ہونے والے کو کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ اندر خدا نہیں ہے اور مسجد کے قریب سے کترا کر گزر جانے والے کو بھی کبھی نہیں کہا تھا کہ ایک بہت بڑی طاقت موجود ہے۔ وہ تو ایک پینٹر تھا۔ اس کا کام دونوں طرح کے لوگوں کے دلوں کے ہیجان اور ذہن کے مدوجزر موج طوفانوں کو برش اور رنگ کی مدد سے کپڑے پر منتقل کرنا تھا اس کے نزدیک دنیا کی ہر شے اپنے اندر پیدا ہونے کی وجہ رکھتی ہے۔ دنیا کی ہر شے دلچسپ اور اثر کرنے والی ہے۔ انسان سے اس کا سلوک اس کے موڈ کا مرہونِ منت تھا۔ کبھی اُسے ہر انسان سے نفرت ہو جاتی اور کبھی کسی بچے کو بازار میں روتا دیکھ لیتا تو اُس کے بھی آنسو نکل آتے۔

جمادات میں انور کو چشمے کی تہہ میں بیٹھے ہوئے گول گول ٹھنڈے پتھر، نباتات میں ہر قسم کے پیڑ، پودے اور پھل پھول اور حیوانات میں صرف ایسی عورتیں پسند تھیں جن کے پیٹ کا نچلا حصہ تھوڑا تھوڑا ابھرا ہوا ہو۔ یعنی جنہیں دیکھ کر اُسے گہرے پُر اسرار اور کرب انگیز جذبۂ تخلیق کا بھرپور احساس ہو۔

انور کی تصویروں میں بھی اس کا یہ رجحان بڑی شدت سے کارفرما تھا۔ اس

نے ننگی عورتوں کی بے شمار تصویریں بنا رکھی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر سفلے اور گھٹیا جذبات کی بجائے عورت کے جسم کی خوبصورتی تناسب، موزونیت اور جذبۂ تخلیق کے تقدس کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ کائنات کی پوری تخلیق میں جنس کا ازلی اور ابدی عمل کارفرما ہے۔ سیب کی سرخی، انگوروں کی شیرینی، ناشپاتی کے سفید پھولوں کی بہار، ندیوں کی پُرسکون روانی، سمندروں کی ہیجان خیزی اور زمین کا سینہ چیر کر نازک پتوں کا پھوٹ پڑنا اسی جذبۂ قدیم کا مرہونِ منت ہے۔ لیکن عورتوں کی عریاں تصویریں ابھی نامکمل سی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انور نے دنیا کے دوسرے مشہور مصوروں کی تصویروں سے نقل کیا تھا اور یا پھر اپنے تخیل کے زور سے بنائی تھیں لاہور میں ماڈل کے مل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صرف چند ایک تصویریں اس نے ایسی بنائی تھیں جن کے لئے اس نے دو ایک بڑی ہی گھٹیا قسم کی طوائفوں کی خدمات حاصل کی تھیں اور ان تصویروں میں عورت کے تقدس کی بجائے عورت کی زبوں حالی، دل شکستگی اور بے حیائی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔ یوں ان تصویروں کے موضوع ہی بدل گئے تھے۔ اُسے تصویر بناتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ روندی ہوئی دھوئی اور بے بس چھپکلی کو پینٹ کر رہا ہو۔ ایک پل کے لئے بھی انور کے دل میں عورت کی حرمت، پاکیزگی، تقدس اور حیا کا جذبہ پیدا نہ ہوا تھا۔ پھر اس نے بھی کالے، مٹ میلے، گہرے، گدلے سبز اور گندے خون ایسے سرخ رنگوں سے ان عورتوں کی زندگیوں کے المیے کو کینوس پر پھیلا دیا اور ان کے گھٹنوں، ٹخنوں اور کہنیوں کی ہڈیوں کو زیادہ نمایاں کر کے ان کے ٹھنڈے سے بے رس بے حس لجلجے جسموں کو زیادہ گھناؤنا بنا دیا۔ ابھی تک بمبئی والی کھیا گھاٹن اور بنگال کی درگا دتی کے مقابلے کی ایک بھی عورت اُس کے رنگوں میں ڈھل کر کینوس پر نہ اتر سکی تھی۔ ان دونوں تصویروں میں انور کا فن اپنے پورے عروج پر تھا۔ یہ انور ہی کا نہیں بلکہ اس کے قریبی دوست یعنی تشکک پسند اور جنگل کی طرف لوٹ چلنے کے خواہشمند ہمایوں کا بھی خیال تھا۔ انور نے ایک بار ہمایوں سے کہا تھا۔

"میں عورت کے انتظار میں ہوں جو مجھے
میرے فن کے اس مقام سے بھی آگے
لے جائے گی۔"

ہمایوں نے پائپ کا دھواں اُڑاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ابھی تمہیں صرف ایک لڑکی کی ضرورت
ہے۔ جس سے تم محبت کرو اور ناکام رہو۔"

"میں لڑکی کا نہیں عورت کا قائل ہوں۔
لڑکی عورت کی غیر مکمل شکل ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔ تمہیں محبت میں ناکامی کے
شدید صدمے کی ضرورت ہے۔ یہ المیہ
تمہارے فن کو جلا بخشے گا۔"

"کیا دقیانوسی باتیں کر رہے ہو۔ اگر میں درخت
نہ ہو کر درخت کی اُس نشاط انگیز تکلیف
کا احساس کر سکتا ہوں جو اُسے اپنی سوکھی
ٹہنیوں پر پھول پتے پیدا کرتے وقت
ہوتی ہے تو میں اپنی محبت کے المیے کو بھی
محسوس کر سکتا ہوں۔"

ہمایوں نے پائپ جھاڑ کر کہا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ عورت اور
مرد کی محبت دو بچھڑے ہوئے ذرّوں
کے ملاپ کی خواہش اور کشش کے عمل
اور ردِ عمل کا نام ہے۔ اس کے باوجود
میں تمہیں دعوے سے کہتا ہوں کہ گو تم

بدھ کی زبان سے گیان دھیان کی باتیں سُن
کر بُدھی بن جانا اور خود بارہ سال جنگلوں میں
تپسیا کر کے گیان حاصل کرنا دو مختلف باتیں
ہیں۔ اور پھر ہر عورت کے بدن کی ایک
مخصوص خوشبو ہوتی ہے۔ تمہیں اس خوشبو
سے ربط پیدا کرنا ہے، سلوک پیدا کرنا ہے
اُسے اپنے بدن کا جزو بنانا ہے اور پھر اُسے
اپنے بدن سے نوچ کر پھینک دینا ہے یہ
ایک بہت حیرت انگیز اور بہت عظیم
تجربہ ہوگا۔ دھوبی محبت میں ناکام ہو کر
ٹھرّہ پیتا ہے یا شادی کر لیتا ہے اور یا پانچ
وقت کا نمازی بن جاتا ہے۔ اور پہلے
سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ کپڑے دھونے
اور بچے پیدا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے
مگر تم آرٹسٹ ہو۔ تمہارے ساتھ اس کا
ردِ عمل کسی اور رنگ کسی اور انداز میں ہوگا۔"

انور نے سگریٹ پھینکتے ہوئے کہا۔

"بہر حال تم اپنی منطق لپیٹ کر رکھو۔ میں
محبت وغیرہ کو کتنی اہمیت دیتا ہوں، تم
اسے خوب جانتے ہو۔ میں ایک عورت
کا انتظار کر رہا ہوں اور میرا فن اپنے تقاضے
کے مطابق وہ عورت مجھے ضرور دے گا۔"

"دیکھنا، کہیں عورت بچے ساتھ نہ لے

آ سکے۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔"

انور میکلوڈ روڈ کی جس عمارت میں رہتا تھا وہاں اور بھی کئی کنبے آباد تھے۔ اس عمارت میں صرف ایک ہی سیڑھی تھی جو آزو بازو سب گھروں کے دروازوں کو چھوتی تیسری منزل تک چلی گئی تھی۔ یہ سیڑھیاں سیمنٹ کی پختہ تھیں اور کافی چوڑی چوڑی تھیں۔ انور دوسری منزل کے ایک کمرے میں مقیم تھا۔ اس عمارت میں ہر قسم کے لوگ رہتے تھے دو ایک جگہوں پر فلم کمپنیوں کے دفتر تھے جہاں ہارمونیم کی تانیں اڑا کرتیں اور بنی سنوری طرحدار عورتوں کی آمد و رفت جاری رہتی۔ اکھڑے ہوئے پلستروں والی چار دیواریوں کے اندر دلی، کانپور، جالندھر اور امرتسر کے کئی ایک گھرانے آباد تھے۔ یہ بھلے مانس لوگ تھے اور بڑی یکسانیت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔

انور نے اپنے ہمسایوں سے کبھی بھی کسی قسم کا سروکار نہ رکھا تھا۔ وہ صبح ہوٹل میں کھاتا۔ شام تک اپنے کمرے کے اندر کام کرتا اور پھر مال روڈ پر الفردوس ہوٹل میں اپنے دوستوں کے پاس آ جاتا۔ پھر بھی اس عمارت کے کچھ لوگ اس میں کچھ دلچسپی لے رہے تھے۔ ان میں ایک بیوہ عورت سرفہرست تھی۔ اس عورت کا خاوند جالندھر میں فسادات میں مارا گیا تھا اور اب وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتی تھی۔ اس نے یہاں کسی نہ کسی طرح ایک آئس فیکٹری میں ایک پیسے کا حصہ لے رکھا تھا۔ جھنگ میں کچھ زمین بھی الاٹ کروا رکھی تھی۔ یہاں بیٹھ کر اس عورت کا کام طرح طرح کے لباس پہن کر عمارت کے رہنے والوں کو دکھانا اور طرح طرح کے لوگوں کا اپنے کمرے میں خیر مقدم کرنا تھا۔ اس کا کاروبار ہی کچھ ایسا تھا کہ انور کو اس سے گھن آتی تھی۔ اور اس نے کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ اس عورت کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ جسم بوجھل اور چہرہ حلوہ کدو ایسا تھا۔ اس پر ٹماٹروں ایسے گال اور بھینس کی سی بڑی بڑی آنکھیں جگمگ کیا کرتیں۔ خیر سے وہ انور پر عاشق تھی اور ہر گھڑی اس کے نام کی مالا جپتی اور اسے اپنے ہاں بلانے کے جتن کیا کرتی۔

مگر انور کبھی اس کے ہاتھ نہ آیا تھا۔ اس عورت کا اصلی نام تو شریفاں بی بی تھا لیکن اپنے نئے دھندے کی رعایت سے اس نے اپنا نام نیلم رکھا ہوا تھا۔ جب انور اپنے کمرے سے باہر نکلتا تو وہ پہلی منزل والے اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی اسے بڑے بڑے دیدوں سے دیکھ رہی ہوتی۔ وہ مسکراتی اور اشارے سے انور کو بلایا کرتی۔ انور چپکے سے نیچے اتر جاتا۔ ایک بار اس نے اپنی خادمہ کے ہاتھ انور کو کہلا بھیجا۔ ظالم! اب تو ظلم کرنا بند کرو اور میرے کلیجے سے لگ کر دل کی آگ بجھاؤ۔ انور نے اس کا جواب یہ دیا کہ کسی ماشکی کی طرف رجوع کرو تو بہتر ہوگا۔

انور کے ساتھ والے دو کمروں میں متھرا کا ایک کنبہ آباد تھا۔ بڑے میاں شاہ عالم مارکیٹ میں کپڑے کی بہت بڑی دکان میں ملازم تھے۔ بیگم گھر پر محلے والوں کا سلائی کا تھوڑا بہت کام کر لیا کرتی۔ دو لڑکے تھے۔ ایک لڑکا کارپوریشن میں کلرک تھا۔ دوسرے کو فلموں میں کام کرنے کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اس کا بہت علاج کیا گیا مگر شفا نہ ہوئی۔ یہ صاحبزادے دن بھر رنگ پارک کے ہوٹلوں میں بیٹھے رہتے اور معمولی معمولی ایکٹروں کے پیچھے مارے مارے پھرا کرتے۔ تین لڑکیاں تھیں۔ دو چھوٹی اور ایک بڑی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ سانولی سلونی، دبلی پتلی تیکھے نین نقش کی لڑکی تھی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی پلکیں جھپکا کر جھکا لیتی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے بندرابن کی کنج گلیوں سے نکل کر کوئی گوپی میکلوڈ روڈ کی اس چوں چوں کا مربہ عمارت میں آگئی ہے۔ اس کا نام صدیقہ تھا۔

انور کو اس کا نام سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ اس نے اپنی یادداشت کے لئے اس کا نام رام کلی رکھا ہوا تھا۔ اسے کبھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ متھرا شہر سے آئی ہوئی لڑکی کا نام صدیقہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا ذکر جب اس نے اپنے مادہ پرست دوست ہمایوں سے کیا تو اس نے ماچس کی تیلی سے پائپ کریدتے ہوئے پھونک مار کر کہا۔

"ہاں صاحب! یہ تو بہت بڑا ظلم ہے
کہ لڑکیوں کے بھی نام ہوں، مادی اعتبار سے

لڑکی کا نام متھرا ہونا چاہیئے یا اگر کوئی نام
ضرور رکھنا تھا تو سیتا پھل رکھ دیا ہوتا۔

لیکن انور کو سیتا پھل پسند نہ آیا۔ کیوں کہ یہ پھل بڑا لجلجہ ہوتا ہے اور ذرا سا دبانے سے پچک جاتا ہے۔ ہمایوں کا خیال تھا کہ یہ پھل جدلیاتی اور حیاتیاتی اعتبار سے اس ملک کے رہنے والوں کے جسموں سے بڑا رسوخ رکھتا ہے۔ صدیقہ کی امی انور کو بڑا اچھا سمجھتی تھی۔ بڑے میاں بھی انور کی شرافت اور خاموشی پسند طبیعت کے بڑے مداح تھے۔ صدیقہ بھی انور کو اچھا سمجھتی تھی۔ کیونکہ ہمارے ہاں جب کسی لڑکے کو ماں باپ پسند کرتے ہیں تو پھر بیٹی بھی اُسے بہت پسند کرتی ہے۔

کبھی کبھی انور اُن کے ہاں بھی چلا جاتا۔ وہاں اُسے گھر کے فرد ایسی حیثیت حاصل تھی اور اس سے کوئی پردہ نہیں کرتا تھا۔ بعد میں انور کو معلوم ہوا کہ صدیقہ کی ماں اُسے اپنا گھر داماد بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ انور نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ ماری اور اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے صدیقہ کے ہاں آنا جانا بہت ہی کم کر دیا۔ اس کی ماں نے اُسے کئی بار بلایا مگر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ اُسے صدیقہ سے صرف اس لئے دلچسپی تھی کہ وہ متھرا کی رہنے والی تھی اور اس کی دانست میں اس کا نام رام کلی تھا۔ وہ تو رام کلی کو کرشن کنہیا کی گوپیوں کی ٹولی سے بچھڑی ہوئی ایک گوپی سمجھ رہا تھا اور یہاں اُسے اس کے ہونے والے بچوں کی ماں بنایا جا رہا تھا۔

ایک بار اُسے کمرے میں صدیقہ عرف رام کلی اکیلی مل گئی۔ اوّل تو ہمارے گھروں میں لڑکی اکیلی ملتی ہی نہیں اور اگر اکیلی مل بھی جائے تو وہ اس طرح شرمانا لجانا شروع کر دیتی ہے جیسے ہزاروں لوگوں کے مجمع میں کھڑی ہو۔ کبھی حلق خشک ہوتا ہے، کبھی زبان ——— کبھی دل دھڑکتا ہے۔ کبھی اُنگلیاں کپکپاتی ہیں اور کبھی زبان میں لرزش آتی ہے۔ کبھی باہر دیکھتی ہے۔ کبھی اندر دیکھتی ہے۔ کبھی ادھر جاتی ہے، کبھی اُدھر جاتی ہے۔ غرضیکہ ایک بڑا ہی دلچسپ اور افسوسناک ڈراما شروع ہو جاتا ہے۔ یہ واحد ڈرامہ ہوتا ہے جس کا پردہ

اُٹھنے کے ساتھ ہی گر پڑتا ہے۔

انور کے ساتھ خود کو کمرے میں اکیلا پا کر صدیقہ عرف رام کلی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے اُنگلی دانتوں میں داب لی اور سہم کر وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔ انور نے آگے بڑھ کر اس کے دانتوں میں سے اُنگلی باہر نکالی۔ کوٹ کے کالر میں سے گلاب کی سُرخ کلی اُتار کر رام کلی عرف صدیقہ کے چرنوں میں ارپن کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”ہے بن سندری! تیرا روپ مہان ہے گلاب کی یہ کلی تیرے ہی جنگل سے مجھے ملنے یہاں آئی تھی۔ میں اسے تیری جھولی میں ڈالتا ہوں۔ تو اس بندرابن کی ہوا ہے جس کا میں سب سے پُرانا درخت ہوں۔ تیری آنکھیں کرشن بھگوان کی بانسری کے سُر ہیں جو سنگیت کے سمندر سے مجھے دیکھ رہی ہیں۔ لاکھوں برس کی بات ہے کہ میں کرشن کا ایک روپ تھا اور تو میری گوپی تھی۔ تو بھول گئی ہے مگر میں تجھے جانتا ہوں۔ لاکھوں برس سے میں گلاب کی کلی سینے سے لگائے تیرے جنم کا انتظار کر رہا تھا متھرا سے لاہور تک لاکھوں سالوں کا فاصلہ تو نے کیسے طے کر لیا! ہری اوم! تیرے پوتر پاؤں میں وقت کی دُھول اور فاصلے کی زنجیریں ہیں۔ کیا وہ دن بھی آئے گا جب تو ہاتھ میں بانسری لے کر کلائیوں میں سرسوتی پھول کے گجرے سجا کر دھرتی کی تال پر رقص کرتی ہوئی وقت اور فاصلے

کی یہ زنجیریں توڑ دے گی اور سنگیت کی
لہر بن کر، محبت کا سہاگ بن کر دنیا کے
اس سرے سے اُس سرے تک پھیل جائے
گی......؟"

صدیقہ نے انور کی باتیں سن کر دوسری انگلی بھی دانتوں میں داب لی۔ وہ گٹھڑی سی بن کر بیٹھ گئی اور صرف اتنا کہہ سکی۔

"کوئی سن لے گا"

"یہ پریم شاستر کے اشلوک ہیں۔ سب کو سننے دو!"

"ہائے کوئی دیکھ لے گا"

"دیکھنے دو"

"کوئی آجائے گا"

"آنے دو"

"ہائے اللہ! کیا کروں۔ خدا کے لئے اس وقت چلے جایئے"

"صدیقہ بیگم! تو صداقت کی پتلی ہے۔ تو اپنے ماں باپ کی عزت کی سچی محافظ ہے عصمت مآب لڑکی! آفرین ہے تجھ پر کہ تیرے قدم بالکل نہیں ڈگمگائے۔ آنے والی نسلیں اگر زندہ رہیں تو تیرا قطب مینار بنائیں گی اور اس کی سیڑھیوں میں عشق و محبت کی آنکھ مچولی کھیلیں گی۔ اچھا میں جاتا ہوں مجھے افسوس ہے کہ میں تیرے لئے گو بھی

کا پھول نہ لاسکا۔

انور نے زمین پر سے گلاب کی سُرخ کلی اُٹھا کر کالر میں لگائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کا ذکر حبیب انور نے ہمایوں سے کیا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ وہ پُرجوش آواز میں ہاتھ لہرا کر بولا۔

"ارے ظالم تو نے متھرا شہر کو آگ لگا دی۔ بندرابن ہاتھ سے کھو دیا۔ ارے وہ لڑکی تو بھاگن کا سیاہ درخت تھا۔ درخت! آہ درخت! سیاہ درخت! خوشبو اور رس دیتا ہوا سیاہ درخت!..."

ہمایوں چیختا چلاتا رہا اور پائپ پر پائپ اور چائے پر چائے پیتا رہا مگر انور نے صدیقہ کی پھر کبھی کوئی بات نہ کی۔

جس روز اس منڈلی میں پیسوں کا توڑا ہوتا اس روز الفردوس ریسٹوران میں چائے کے بعد آپس میں چندہ ڈالا جاتا۔ ایسا مرحلہ عام طور پر مہینے کی آخری تاریخوں میں پیش آتا جبکہ انور کے کمرشل کام کے بلوں کی وصولی میں دیر ہو جاتی۔ ادھر سعید، یوسف اور ہمایوں کی جیبیں بھی یکم کے انتظار میں خالی ہو جاتیں۔ پھر بڑا مزا آتا۔ جس کی جیب میں جو نکلتا وہ میز پر رکھ دیتا۔ پھلوں کے آڑھتی کا لڑکا اکبر جو اقبال کی شاعری کا عاشق تھا اور بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد باپ کی کمائی پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ ہر روز باپ کی تجوری میں سے کچھ نہ کچھ اڑا لاتا اور اس طرح اس منڈلی کے یہ دن بھی بڑے مزے میں گزر جاتے۔

اکبر اقبال کی رو سے اسلام کا مطالعہ کر رہا تھا اور خودی کو بلند کرنے کے بہت حق میں تھا۔ ایک دفعہ جب اُسے معلوم ہوا کہ ہمایوں ایک ایسی معمر عورت سے عشق کر رہا ہے جو دولت مند ہے تو اُس نے ہمایوں کو سمجھانا شروع کر دیا۔

"تم اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو سالے!
اپنے ضمیر کو دھوکا دے رہے ہو۔ اس عورت
کو دھوکا دے رہے ہو۔ اس سے محبت نہیں
کرتے۔ مگر محض اس کے پیسے ہضم کرنے
کے لئے اُسے محبت کا دھوکا دے رہے
ہو"

"دنیا میں سب ایک دوسرے کو دھوکا دیتے
ہیں اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ وہ عورت اپنے
آپ کو دھوکا دیتی ہے۔ میں اُس عورت کو دھوکا
دیتا ہوں۔ یہ دنیا دھوکے پر قائم ہے۔ اگر
دھوکا نہ ہو تو یہ سارا ڈھانچہ دھڑام سے گر پڑے
اس بدصورت موٹی عورت کو محبت کی ضرورت
ہے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں اُسے
محبت دیتا ہوں۔ وہ مجھے پیسے دیتی ہے۔
ہم ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کر رہے
ہیں۔ ہم دونوں صحیح معنوں میں انسانیت کی
خدمت کر رہے ہیں"

"تم اپنا مُنہ کالا کر رہے ہو۔ تم ذلّت کے
گڑھے میں گرتے جا رہے ہو۔ تمہیں اپنے
آپ کو اس گناہ سے بچانا چاہیئے۔

"اکبر! زبان سنبھال کر اور اقبال کی ٹوپی دماغ سے
اُتار کر بات کیا کرو۔ دیکھنے! میں بھی ایک طرح سے
اپنی خودی بلند کر رہا ہوں"

"بکواس بند کرو۔ حرامزادے! اقبال کا نام
بدنام نہ کرو۔ اقبال اس عہد کا پیغمبر ہے۔ وہ
سب سے بڑا قومی شاعر ہے۔

ہمایوں پائپ کا کش لگا کر قہقہہ مار کر ہنسا۔

"سرسیّد سے لے کر اقبال تک تم سب
قومی لوگوں نے ہماری بنیادیں کھوکھلی کر دی
ہیں۔ تم قوم قوم اور اسلام اسلام کا ڈھنڈورا
پیٹتے ہو اور خود کبھی نماز نہیں پڑھتے۔ کبھی کسی
غریب لڑکی کی شادی پر خرچ نہیں کرتے،
کبھی خیراتی اداروں کو چندہ نہیں دیتے۔ مولانا
شرر اکبر الٰہ آبادی اور اقبال۔ یہ سب لوگ
اسلام کے شیدائی اور انگریزوں کے دشمن
تھے۔ انہوں نے مغربی تہذیب کی ہمیشہ مخالفت
کی اور ان سبھوں نے اپنے اپنے بیٹوں،
پوتوں کو ولایت میں اعلےٰ تعلیم کے لیے
بھیجا اور انہیں اعلیٰ سرکاری افسر بنایا۔ میں کسی
شاعر کو محض اس لیے سب سے بڑا شاعر

تسلیم نہیں کرسکتا کہ اس کی تصویر پان والے
کی دکان پر لگی ہوئی ہے۔"

"بڑا شاعر اپنے آپ کو تسلیم کروالیتا ہے
غالب کو اس کے زمانے میں کسی نے
اہمیت نہیں دی تھی لیکن آج ہر آدمی غالب
کی عظمت کو تسلیم کررہا ہے۔ اقبال کو اس
کے زمانے میں بھی عرفان ملا ہے اور آنے
والے دور میں بھی یہ شہرت برقرار رہے گی۔"

"بلکہ یوں کہو کہ تمہارے اقبال کے ساتھ
اُلٹ معاملہ ہوگا۔ آنے والے دور میں اس
کی شاعری کو اتنی اہمیت نہیں دی جائے گی۔"

اکبر جھلا کر بولا۔

"ہمایوں! کمینے! تمہیں ایک بات بتادوں،
اقبال ہر دور کا، ہر ملک کا شاعر ہے۔ وہ صرف
اسلام کا شاعر ہی نہیں بلکہ فطرت کا شاعر ہے
اس نے نیچر کے اسرار کی پردہ کشائی کی
ہے اور نیچر کے کبھی نہ مٹنے والے اصولوں
کی ہم نوائی کی ہے۔ اقبال ایک تہذیب، ایک
کلچر، ایک طریقِ کار کا نام ہے۔ اقبال زندگی کا
مفسّر ہی نہیں، رزم گاہِ حیات کا نڈر سپاہی

بھی ہے۔ وہ ایک شعلہ ہے جو مُردہ دلوں
میں نئی زندگی کی آگ بھڑکاتا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے لیکن اس آگ سے کھانا نہیں
پکایا جاسکتا۔"

"تم نانبائی بن کر اقبال پر بحث کررہے ہو۔"

"روٹی کے مسئلے کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر
سکتے۔"

"اب بکواس بند کرو۔"

"بہت اچھا۔"

اکبر بھی فرصت کے وقت تصویریں بنایا کرتا تھا۔ اس کی تصویریں جامد زندگی کے
خاکے میں تھیں۔ ہمایوں جو تصویریں پینٹ کرتا وہ کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ رشک پسند طبیعت
تھی۔ تاہم وہ ہر تصویر کو ایک مسئلہ بنا دیتا اور کسی کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ وہ کینوس پر تین چار
الٹی ترچھی لکیریں کھینچ کر نیچے بل لکھ دیتا۔ دو تکونیں بنا کر نیچے "عورت نہا رہی ہے"
لکھ دیتا۔ اور لوگ سر پکڑ کر رہ جاتے۔ اکبر جامد لائف میں پیٹل اور آئیل دونوں رنگوں
سے کام لیتا۔ پیٹل کلر کی تصویروں میں وہ رنگوں کے نقطے اس طرح بناتا کہ بیک گراؤنڈ
میں گول چکر، گردش کرتے دکھائی دیتے اور آئیل میں ان دھبوں پر چھینٹوں کا گمان ہوتا۔
نقاد اور مادہ پرست یوسف کے خیال میں اکبر کا یہ اسلوب آواگون پر اعتقاد کا
اذہانی مظہر تھا۔ سبز آنکھوں والے عینک پوش شاعر صبا کو یہ گلہ تھا کہ پینٹر لوگ مسلمانوں
کی روایات کو نظر انداز کررہے ہیں۔ دُبلا پتلا نازک مزاج سعید کہتا۔

"اسلام نے تو فنونِ لطیفہ کا قلع قمع کیا
ہے۔"

صبا اس کے جواب میں کہتا۔

"آپ لوگوں نے اسلام کو غلط سمجھا

ہے۔ اسلام نے فنونِ لطیفہ کی پرورش
کی ہے۔ تاج محل کے مینار، الحمرا کے باغات
مسجدِ قرطبہ کے محرابوں پر آیات کی تزئین اور
پھول پتیوں کی میناکاری اور اصفہان و سمرقند
کے گنبدوں پر خطاطی کے نادر نمونے اس
کا بہترین جواز مہیا کرتے ہیں۔"

اکبر سگریٹ کا نیا پیکٹ کھول کر بیچ میں رکھتے ہوئے کہتا۔

"مفلوک الحال کمینے دوستو! لاہور کی چار
دیواری کی بات کرو۔ اصفہان و سمرقند بہت
دُور ہیں۔"

کسی وقت یہ ساری منڈلی ہوٹل سے اُٹھتی اور انارکلی اور یونیورسٹی کا چکر لگانے چل پڑتی۔ ان دونوں جگہوں پر یہ لوگ زیادہ تر خوبصورت، بدصورت، خوش وضع، بد وضع سب قسم کی لڑکیوں کو دیکھنے جایا کرتے۔ ایسی لڑکیاں جو صوبے خان سے قمیص سلواتی ہیں رومانی جاسوسی ناول پڑھتی ہیں۔ انگریزی فلمیں دیکھتی ہیں، کاروں اور ہوائی جہازوں پر لمبی لمبی سیروں کے خواب دیکھتی ہیں اور بال کٹوا کر مال اور انارکلی کے چکر لگاتی ہیں۔ اپنے اپنے انداز میں ہر دوست ہر ایسی لڑکی پر تبصرہ کرتا۔ سکن ٹائیٹ قمیصوں کے نئے ڈیزائنوں پر بحث ہوتی اور خوش باش دوستوں کی یہ ٹولی واپس پھر الفردوس ہوٹل میں آجاتی۔ اسی طرح ایک روز انارکلی کا چکر لگاتے ہوئے انور نے نجمہ کو دیکھا۔ وہ نجمہ جو بعد میں انور کی بیوی بنی۔

۵

موسمِ سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔

لوگوں نے گرم کپڑے نکال لئے تھے۔ لاہور کے لوگ ویسے بھی جاڑے کے بڑے شوقین ہیں اور وقت سے بہت پہلے سویٹر کوٹ پہن کر باہر نکل آتے ہیں مال روڈ پر یونیورسٹی کے ارد گرد کالج سے فارغ ہو کر اب سیدھا گھر آنے کی بجائے اپنے دوستوں کے ساتھ انارکلی اور یونیورسٹی کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ انارکلی کی چہل پہل اور یونیورسٹی کا عقبی فوارہ اور باغ اُسے بڑے پسند تھے۔ ایک روز حسبِ معمول وہ یوسف اور ہمایوں کے ساتھ یونیورسٹی کی عمارت کا چکر کاٹ کر فوارے اور باغ کی تعریف میں ایک آدھ جملہ کہنے کے بعد انارکلی کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک لڑکی پر جا پڑی۔ ویسے تو ان لوگوں کی نظر ہر لڑکی پر پڑا کرتی تھی۔ کوئی لڑکی ان کی نظر سے بچ کر گزر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن یہ لڑکی جو اپنی ایک سہیلی کے ساتھ انارکلی کی دکانوں کے سامنے سے گزر رہی تھی اپنے اندر بھرپور دلکشی رکھتی تھی۔ اُس کا قد اُونچا، جسم بھرا بھرا رنگت گوری اور ناک ستواں تھی۔ شگفتہ چہرے پر کنوارپنے کی تازگی اور حیا تھی۔ وہ سفید شلوار پیازی رنگ کی پلین چست قمیص میں ملبوس تھی۔ پاؤں میں بادامی پمپی تھی اور گلے میں پیازی رنگ کا دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ اُس لڑکی نے ہاتھوں میں کتابوں کے ساتھ انگوری رنگ کا سوئیٹر بھی اٹھا رکھا تھا۔

یہ لڑکی اپنے ناٹے قد کی سہیلی کے ساتھ لوہاری دروازے سے مال کی طرف

آ رہی تھی اور انور مال روڈ کی طرف سے لوہاری دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ بمبے کلاتھ ہاؤس کے قریب ان کا آمنا سامنا ہوا۔ انور اُسے دیکھتے ہی ٹھٹھک سا گیا اُسے یوں لگا جیسے جس لڑکی یا عورت کا وہ منتظر تھا وہ آگئی ہے یوسف اور ہمایوں بھی اس لڑکی کے حسن اور سادگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ لڑکی ان لوگوں کو کسی قسم کی اہمیت دیئے بغیر اپنی سہیلی سے باتیں کرتی ہوئی ان لوگوں کے قریب سے گزر گئی انور نے ہمایوں سے کہا۔

"ہمایوں! وہ عورت مل گئی۔"

ہمایوں پائپ جیب سے نکالتے ہوئے بولا۔

"مبارک ہو۔"

یوسف نے کہا۔

"خواہ مخواہ میرا ابھی وقت ضائع نہ کرو۔ ابھی کئی لڑکیاں دیکھنی باقی ہیں۔ ابھی تو آدھی انارکلی رہتی ہے۔"

انور نے کہا۔

"یوسف! تم انارکلی کا چکر لگاؤ۔ میں اور ہمایوں اس لڑکی کے پیچھے جائیں گے۔"

یوسف بولا۔

"تم لوگوں کو شرم آنی چاہیئے۔ کوئی لڑکی اس قابل نہیں ہوتی کہ اس کا تعاقب کیا جائے۔"

ہمایوں نے پائپ سلگا کر کہا۔

"حیاتیات کی رُو سے ہر نر اپنے مادہ کی طرف قدرتی طور پر رجوع کرتا ہے۔ جنسی تاریخ کا پہلا باب اسی اصول سے شروع

ہوتا ہے۔"

یوسف سر جھٹک کر بولا۔

"تم اور تمہاری حیاتیات جائیں جہنم میں۔"

اور اتنا کہہ کر وہ اکیلا ہی انارکلی میں لوہاری کی طرف چل پڑا۔ انور اور ہمایوں اس لڑکی کے تعاقب میں روانہ ہوگئے جو اس وقت ان سے پندرہ بیس قدموں کے فاصلے پر چلی جا رہی تھی۔ انور کو اس کی چال انتہائی مانوس معلوم ہوئی جیسے کسی زمانے میں وہ خود اسی طرح چلتا رہا ہو۔ اس لڑکی کی چال میں ایک طرح کا توازن، ضبط اور بے نیازی سی تھی جیسے کوئی شخص بڑی احتیاط اور پابندی کے ساتھ شراب پی رہا ہو۔ اس کا پہلا قدم بڑا ناپ تول کر اُٹھتا مگر دوسرا قدم بڑے لاابالی انداز میں پڑتا۔ اس کا جسم اس قدر متناسب، خوبصورت اور موزوں تھا کہ انور ایسا آرٹسٹ اس کا متوالا ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

ایک جگہ پہنچ کر وہ لڑکی ایک کپڑے کی دکان میں داخل ہوگئی۔ انور اور ہمایوں بھی اس دکان میں جا گھسے۔ اندر جا کر انہوں نے دیکھا کہ وہ لڑکی اپنی سہیلی کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی ہے اور سیلزمین اُسے مختلف ڈیزائنوں میں کریب کے تھان دکھا رہا تھا۔ انور اور ہمایوں بھی ان کے بالکل سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے سیلزمین نے کہا۔

"معاف کیجئے گا مردوں کا کپڑا اس کاؤنٹر پر ملتا ہے۔"

انور نے کہا۔

"مگر ہمیں عورتوں کے لئے کپڑا چاہیئے۔"

اس لڑکی نے ایک پل کے لئے انور کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لئے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ لڑکی نے اپنی آنکھیں ہٹا لیں اور دکاندار سے کپڑے کا بھاؤ دریافت کرنے لگی۔ انور کا دل زور زور

سے دھڑکنے لگا۔ اُسے زندگی میں پہلی بار محبت کی گرمی اور اس پُراسرار جذبے کی ناگہانی تخلیق کا احساس ہو رہا تھا۔

لڑکی کی آواز بڑی نازک، چمکیلی اور خواب انگیز سی تھی۔ انور بھی قریب کے تھان دیکھنے لگا۔ انور نے ایک ڈیزائن پسند کرنے کے بعد دوکان دار سے پوچھا۔

"کیوں صاحب! اس کے لئے دوپٹہ کس
رنگ کا ہو؟"

دوکاندار نے کہا۔

"جس رنگ کے پھول ہیں جناب!"

انور اس دوکاندار سے زیادہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن وہ خاموش رہا اور پھر اچانک اس لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"معاف کیجئے محترمہ! ہم ان باتوں سے
ناواقف ہیں۔ آپ بتا سکتی ہیں۔ اس
رنگ کی قمیض کے ساتھ دوپٹہ کس کلر کا
ہونا چاہیئے؟"

لڑکی چونک سی پڑی۔ اُسے اس اچانک تخاطب کی بالکل توقع نہیں تھی۔ وہ زیرِ لب ذرا سا مسکرا کر اور ذرا سا گھبرا کر بولی۔

"جس رنگ کے پھول ہیں۔"

انور کو ایسے محسوس ہوا جیسے خواب میں گھنٹیاں بج اُٹھی ہیں۔

"پھول؟ پھول تو کئی رنگوں کے ہوتے
ہیں۔ عنابی، گلابی، زرد، کاسنی، سفید، پیازی۔"

لڑکی خاموش رہی۔ اُس کی ناٹے قد کی بھدے سے ناک والی سہیلی بولی اس کا لہجہ ذرا ترش تھا۔

"ان کا مطلب ہے جس رنگ کے
پھول اس کپڑے پر بنے ہیں۔"

"بہت خوب! تو اس کا مطلب یہ ہوا
کہ پیازی رنگ کا دوپٹہ میچ کرے گا۔ مگر
محترمہ! اس طرح یہ پھول دوپٹے کی موجودگی
میں دب نہیں جائیں گے؟"

اس لڑکی اور اس کی سہیلی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ کوئی شئے خریدے بغیر وہاں سے اُٹھ کر چل دیں۔ دوکان دار نے قہر آلود نظروں سے انور اور ہمایوں کو دیکھا۔ مگر غصہ پی گیا۔ جب انور نے تھان پرے رکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب، یہ کپڑا ہمیں پسند نہیں۔" تو
دوکان دار نے دانت پیس کر کہا۔

"تو پھر جو چیز آپ کو پسند ہے، وہ تو
ابھی ابھی یہاں سے چلی گئی۔"

ہمایوں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"دوست! اسی لئے تو ہم بھی جا رہے
ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی دونوں دوست اس دوکان سے باہر نکل آئے۔ اب ان لڑکیوں کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ دونوں لڑکے ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ناٹے قد کی بھدی سی ناک والی بدصورت لڑکی نے کئی بار پیچھے گھوم کر ان لوگوں کو دیکھا مگر اس لڑکی نے ایک بار بھی گردن پیچھے نہ موڑی۔ دراصل اپنی سہیلی کی زبانی اسے پیچھے کا سارا حال معلوم ہو رہا تھا۔ دھنی رام روڈ پر پہنچ کر دونوں لڑکیاں تانگے میں سوار ہو گئیں۔ اور انور اور ہمایوں ان کا منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ کیونکہ اس وقت وہاں اور کوئی بھی تانگہ موجود نہ تھا۔ انور اب ان کے تعاقب

میں دوڑ نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر دوسرا تانگہ موجود ہوتا تو وہ اس میں بیٹھ کر اُس لڑکی کے گھر کا پتہ معلوم کر سکتا تھا۔ تانگہ دونوں لڑکیوں کو لے کر دھنی رام روڈ پر میو ہسپتال کی جانب چلا جا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں تانگے کے پیچھے بیٹھی ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں اور وہ دونوں وہاں کھڑے انہیں تک رہے تھے۔

"اب یہاں کیا کھڑے ہو۔ چلو کسی دوسری لڑکی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔"

"نہیں ہمایوں! اب میری تلاش ختم ہوتی ہے۔ اب مجھے ایک بار پھر اسی لڑکی کو تلاش کرنا ہے۔"

"مگر اتنے بڑے شہر میں اُسے کہاں ڈھونڈتے پھرو گے؟"

انور نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"میرے جذبۂ جستجو کے مقابلے میں یہ شہر بہت چھوٹا ہے۔ یہ لڑکی مجھے ضرور ملے گی۔ بہت جلد پھر ملے گی۔"

ہمایوں نے سر جھٹک کر کہا۔

"دیکھیں کہاں ملتی ہے۔ اس وقت تک تم اُسے بھول گئے ہو گے۔"

انور نے کہا۔ اب وہ دونوں مال روڈ پر آ گئے تھے۔

"نہیں ہمایوں! میں اس لڑکی کے خدوخال اور اس کی چال کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس لڑکی نے میرے دل پر اپنا گہرا اثر چھوڑا

ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ اس نے اپنے نقش کو میرے دل میں پھر سے بیدار کیا ہے۔ میں اسی لڑکی کا انتظار کر رہا تھا۔"

الفردوس میں انہیں یوسف بھی مل گیا۔ اس نے گردن کھجلا کر اپنی پھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیوں میاں مجنوں! انارکلی کی دشت نوردی میں محملِ لیلیٰ کا سراغ ملا؟"

ہمایوں نے کہا۔

"شٹ اپ۔"

اس واقعے کو پندرہ بیس روز گزر گئے لیکن انور کو وہ لڑکی پھر دکھائی نہ دی۔ اس کی تلاش میں وہ ہر روز یونیورسٹی اور انارکلی کے چکر لگاتا۔ زم زمہ سے لے کر چیرنگ کراس تک پوری مال روڈ کی خاک چھانتا، شیزان میں جھانک کر دیکھتا، سینما گھروں کے طواف کرتا مگر گوہرِ مقصود کا کہیں نشان نہ ملتا۔

ایک روز وہ اکیلا ہی اورینٹل کالج میں اپنے کسی دوست سے مل کر یونیورسٹی کے دفتروں میں سے گزر کر یونیورسٹی کی چھوٹی سی مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک اُسے وہ لڑکی دکھائی دی انور کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ آج اس نے بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا اور پوری آستینوں کا سبز سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ کتابیں ہاتھ میں لٹکائے وہ اپنی مخصوص چال چلتی فوارے کی جانب سے باہر کو جا رہی تھی اس نے بھی انور کو دیکھ لیا تھا اور اب ذرا چوکنی سی ہو کر چلنے لگی تھی۔ انور بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔ انور بھی ساتھ ہی آ گیا اندر کمرے میں پہنچ کر وہ ایک لڑکی سے باتیں کرنے لگی اور انور دیوار پر لگی ہوئی اپنے ہم عصر مصوروں کی تصویریں دیکھنے لگا۔ یہاں اس کی دو تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک درگا وتی کی تصویر "بنگالی لڑکی" اور دوسری ایک لینڈ سکیپ

جس میں اُس نے نارنجی، گہرے سبز اور وائیلٹ رنگوں میں دریائے راوی کے کنارے کو پینٹ کیا تھا۔ وہ لڑکی اپنی سہیلی کے ساتھ کمرے میں گھوم پھر کر تصویریں دیکھنے لگی۔ اچانک انور کو اس کا ایک پینٹر دوست مل گیا جو اُن دونوں لڑکیوں کا واقف کار تھا۔ اُس نے انور کا ان دونوں لڑکیوں سے تعارف کروایا۔

"بھئی آپ لوگ انہیں نہیں جانتے! یہ انور ہیں۔ ہمارے مشہور پینٹر۔ ان کی دو تصویریں یہاں بھی موجود ہیں۔"

"اچھا تو آپ ہیں انور!"

اُس لڑکی نے کہا جس سے انور کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری لڑکی خاموش رہی۔ انور کے دوست نے کہا۔

"بھئی آپ نزہت کھوکھر ہیں۔ اور آپ نجمہ ہیں۔ یہ نفسیات کا ایم۔ اے کر رہی ہیں۔"

انور نے نجمہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

نجمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس چپکی ہو کر دیوار پر لگی تصویروں کو دیکھتی رہی دوسری لڑکی بڑی چہکتی رہی اور خواہ مخواہ سمارٹ بننے کی کوشش کرتی رہی۔ تو اس کا نام نجمہ ہے اور نفسیات کا ایم۔ اے کر رہی ہے۔ انور اب نجمہ کی طرف سے بہت حد تک بے فکر ہو گیا تھا۔ اس اعتبار سے کہ وہ اب جس وقت چاہے اُسے مل سکتا ہے۔ کچھ دیر مختلف مصوروں کی تصویریں دیکھنے کے بعد دونوں لڑکیاں وہاں سے باہر نکل گئیں انور نے بھی اپنے پینٹر دوست سے اجازت لی اور باہر آگیا۔ یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر آکر انور نے دیکھا کہ وہ دونوں لڑکیاں فٹ پاتھ پر کافی ہاؤس کی طرف جا رہی تھیں انور سگریٹ سلگائے چپ چاپ اُن کے پیچھے چلتا گیا۔

چوراہے میں نجمہ کو اس کی وہی بدصورت بھدّے ناک والی سہیلی مل گئی۔ اب یہ تینوں لڑکیاں کافی ہاؤس میں داخل ہو گئیں۔ انور جانتا تھا کہ تینوں لڑکیاں کافی ہاؤس کی گیلری میں بیٹھی ہوں گی جہاں وہ اکیلا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ کافی ہاؤس کی گیلری میں بیٹھنے کے لئے اس کے ساتھ کوئی کزن ضرور ہونی چاہیئے۔ انور کافی ہاؤس کے بالمقابل لیڈیز کارنر میں اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ لیکن اس کی نگاہیں برابر کافی ہاؤس کے دروازے پر لگی رہیں۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد تینوں لڑکیاں کافی ہاؤس سے باہر نکلیں۔ انور لیڈیز کارنر سے نکل کر لمبے ڈگ بھرتا وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال کی طرف آگیا۔ کیونکہ وہ تینوں اس طرف آرہی تھیں۔ یہاں انور نے سوچا کہ اس طرح نجمہ کا سامنا کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں اُن دونوں کی ہیٹی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ ہوٹل الفردوس کی طرف گھوم گیا۔ مگر ہوٹل کے دروازے پر پہنچ کر وہ ان تینوں کو مال روڈ پر ریگل کی طرف دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو انور سگریٹ سلگا کر الفردوس میں داخل ہو گیا۔

نجمہ کے بارے میں انور نے پوری پوری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ نجمہ محکمہ آثارِ قدیمہ کے ایک ذمہ دار افسر کی صاحبزادی ہے اور اکلوتی بیٹی ہے۔ اور فیروز پور روڈ پر رہتی ہے۔ اور وہاں سے کبھی والد کی کار میں اور کبھی بس میں سوار ہو کر یونیورسٹی آتی ہے اور بس میں ہی واپس گھر جاتی ہے۔ اب انور کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ آرٹس کالج سے نکل کر میکلوڈ روڈ پر اپنے کمرے میں آنے کی بجائے وہیں مال پر رہتا تھا اور یونیورسٹی کے ارد گرد اکیلا منڈلاتا رہتا تھا۔ اس نے محض اس خیال سے کہ اس کی حالت دیکھ کر اس کے دوست کہیں لڑکی کو بدنام نہ کر دیں۔ دوستوں سے ملنا جلنا کافی حد تک ترک کر دیا تھا۔ صرف اس کا خاص دوست ہمایوں کبھی کبھی اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔ وہ نجمہ سے محبت کرنے لگا تھا اور اُسے اُس کی عزت کا بیحد خیال تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نجمہ کسی وجہ سے بدنام ہو جائے۔

اس دوران میں انور کا نجمہ سے دو تین بار آمنا سامنا ہوا تھا۔ انور نے نجمہ کو سلام کیا تھا۔ اور اُس نے آہستہ سے نظریں جھکا کر جواب دیا تھا۔ بس سے ان دونوں کا معاشقہ ابھی یہاں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ لیکن انور بہت جلد اس مقام کو عبور کر جانا چاہتا تھا۔ وہ نجمہ کو اپنے قریب سے قریب دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ راز و نیاز کے ابتدائی مراحل میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سارے لاہور شہر میں اُسے صرف ایک لڑکی پسند آئی تھی اور وہ اس لڑکی کو بہت جلد اپنے حلقۂ فن اور دائرہ عمل میں لانا، چاہتا تھا مگر نجمہ اُسے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ اول تو بہت کم اکیلی ہوتی۔ وہ بدصورت ناٹے قد کی لڑکی ہمیشہ اُس کے ہمراہ ہوتی اور جب اکیلی ہوتی تو انور کو بات کرنے کا موقعہ نہ ملتا۔ اس وقت یا تو وہ مال پر ہوتی اور یا بس سٹاپ پر کھڑی ہوتی۔

آخر ایک روز انور کو موقعہ مل ہی گیا۔

وہ آرٹس کالج سے نکل کر یونیورسٹی میں داخل ہو رہا تھا کہ اُس نے ایک جانب باغ کے گوشے میں ایک درخت کے نیچے نجمہ کو گھاس پر بیٹھے پڑھتے دیکھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک مالی ذرا فاصلے پر گملوں میں مٹی بھر رہا تھا انور کچھ سوچے سمجھے بغیر سیدھا باغ میں گیا۔ اور نجمہ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ نجمہ [illegible] سی ہو گئی اور ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔

"مطالعے کے لیے یہ جگہ بڑی موزوں ہے"

"جی"

اس کے بعد پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ انور کے دماغ میں خیالات کا طوفان موجزن تھا۔ نجمہ کی نظروں میں بھی کتاب کی سطریں ناچ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی انور اُسے کیا کہنا چاہتا ہے اور کب سے اس کے سامنے اپنا دل کھولنے کے بہانے تلاش کر رہا ہے۔ لیکن نجمہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انور اتنی بے باکی اور صاف

گوئی سے بھی کام لے سکتا ہے۔ انور نے نجمہ کی ایک کاپی اٹھا کر اُسے کھولا اور انگریزی میں لکھے نوٹس پر انگلی پھیرنے لگا۔ اچانک اس نے کاپی بند کر دی۔ اور سامنے ایک ٹنڈ منڈ درخت کی طرف نگاہیں جما کر بولا۔

"مجھ سے شادی کرو گی نجمہ؟"

نجمہ پر جیسے کسی نے اچانک ٹھنڈے پانی کا تسلہ انڈیل دیا۔ وہ تو سُن ہو کر رہ گئی۔ وہ اس سوال کے لیئے بالکل تیار نہ تھی۔ انور بھی اپنے اس سوال پر حیران ہو کر رہ گیا۔ کیا یہ بات اُس نے کہی تھی؟ وہ جو شادی کو انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ سمجھتا تھا۔ وہاں ایک پل کے لیے بڑی معنی خیز اور گہری خاموشی طاری ہو گئی انور نے سگریٹ سلگایا اور کہنے لگا۔

"تم سوچ رہی ہو گی اس لڑکے کا دماغ
خراب ہو گیا ہے جو ایک دو روز کی سلام
دُعا کے بعد شادی کا پیام لے کر آگیا ہے
میں بھی تم سے یہی کہنا چاہتا ہوں نجمہ کہ
میں تمہیں ایک دو روز سے نہیں جانتا
بلکہ اس وقت سے جانتا ہوں جب تم
ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی لیکن تم ان
باتوں کو چھوڑو۔ آج کی بات یہ ہے کہ
تم میری منتخب لڑکی ہو۔ میں تمہارے
بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ یا اگر زندہ رہوں
گا بھی تو اس طرح جس طرح پھانسی کی کوٹھڑی
میں موت کی سزا پانے والا ملزم رہتا ہے
جس کی موت کی سزا میں تاخیر ہو رہی ہو
بولو! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

نجمہ نے جواب دینے کی بجائے کتابیں اور کاپی اُٹھائی اور چپکے سے اُٹھ کر باغ سے باہر نکل گئی۔ انور وہاں بیٹھا رہا اور تنکا منہ میں دبائے نجمہ کو باہر روش پر جاتے اور نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ جب نجمہ دوسری طرف گھوم گئی تو وہ کتنی ہی دیر تک وہاں باغ میں گھاس پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور نجمہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

اس کے بعد کئی روز تک ایسا ہوتا رہا کہ جب کبھی نجمہ کا انور سے سامنا ہوتا تو وہ کترا کر نکل جاتی اور انور کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی۔ انور کو اب یقین ہو گیا تھا کہ نجمہ اس سے محبت کرے یا نہ کرے لیکن وہ اس سے دُور ہو کر نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک نہ ایک دن اس کے پاس ضرور آئے گی اس لئے کہ وہ نجمہ کے بارے میں خوش وقتی اور ہوس پرستی کے خیالات نہیں رکھتا تھا۔ وہ نجمہ سے اس قسم کی محبت بھی نہیں کرتا تھا جو خواہ مخواہ ایک آدمی کو دوسرے کا غلام بنا کر رکھ دیتی ہے اور جس کی بنیاد محض جنسی جذبہ ہوتی ہے۔ وہ پینٹر تھا اور زندگی کے مظاہر کے بارے میں اس کا ایک بڑا واضح اور ٹھوس نظریہ تھا۔ ٹھوس ان معنوں میں کہ وہ ان مظاہر کی فلسفیانہ یا نفسیاتی تاویلات پر بھروسہ نہ کرتا تھا اور نہ اُس نے کبھی اس قسم کے تجزیوں کی ضرورت ہی محسوس کی تھی۔ نجمہ کو اُس نے ایک پینٹر کی نگاہ سے دیکھا تھا اور اگر نجمہ کا جسم اتنا خوبصورت، صحت مند اور متناسب نہ ہوتا تو وہ کبھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ انور کو نجمہ کے بھرپور جسم میں ایک نوعمر درخت ایسی تازگی اور موسمی اثرات کو قبول کرنے کا صحت مند رجحان نظر آیا تھا۔ وہ نجمہ کے جسم کو اپنے فن اور فن کی تکمیل کے تقاضوں کے لئے اپنے پاس لانا چاہتا تھا اور چونکہ یہاں سوائے شادی کے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے کمال ایمانداری اور دیانت داری سے نجمہ کو شادی کی پیش کش کر دی تھی۔ نجمہ پر انور کی اس بے باک پیش کش کا ردِ عمل زیادہ خوشگوار نہیں ہوا تھا۔ تاہم وہ انور کے جذبے کی سچائی سے بڑی متاثر ہوئی تھی۔ اس نے اسی روز سارا واقعہ اپنی بدصورت سہیلی عابدہ

کو سنایا تو اس نے کہا۔

"ان مردوں کا کوئی اعتبار نہیں یہ جس طرف سے اور جس انداز میں آئیں ان کا مقصد سوائے تباہی کے اور کوئی نہیں ہوتا۔"

نجمہ نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں عابدہ! وہ ایسا نہیں ہے۔ انسان کے دل کا حال اس کے چہرے اور باتوں سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ جب وہ بول رہا تھا تو اس کے چہرے پر سوائے سادگی کے اور کچھ نہیں تھا۔"

"تم بے شک نہ مانو۔ مگر میں یہی کہوں گی کہ مرد جب عورت سے بات کر رہا ہوتا ہے تو اُس کا چہرہ ہمیشہ دھوکا دیتا ہے۔"

عابدہ کی اس قسم کی باتوں اور انتباہ کے باوجود نجمہ انور کی طرف کھچتی چلی گئی۔ سچائی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جھوٹ کتنے اعتماد سے بولا جائے اس کی بنیاد ہمیشہ کھوکھلی ہوتی ہے اور جلد یا بدیر سارا ڈھانچہ زمین پر آ گرتا ہے۔ دوسری طرف سچی بات کتنی بے دلی سے ہی کیوں نہ کہی جائے اس کا تیر ہمیشہ ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے۔ اور اس کا اثر غیر فانی اور محکم ہوتا ہے۔

چنانچہ انور اور نجمہ چند ہی مہینوں میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اب وہ دونوں اکثر کافی ہاؤس میں اکٹھے داخل ہوتے اور باہر نکلتے دیکھے جاتے نجمہ اس کا بڑا دم بھرتی۔ اور اس کی چھوٹی سی چھوٹی بات کا بڑا خیال رکھتی۔ لیکن انور کو نجمہ کے باپ کی نیک نامی اور نجمہ کی عزت کا بھی خیال تھا۔ اس لئے وہ اُسے

مال روڈ پر کبھی لئے لئے نہ پھرتا۔ دوسرے تیسرے اُسے ایک خاص مقام پر پاتا اور وہاں سے دونوں کافی ہاؤس میں آجاتے۔ محبت کرنے والے لاکھ احتیاط کریں لوگوں کی نگاہیں اُنہیں کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ ہی نکالتی ہیں اور بدنام کرنے سے بھی یہ لوگ کبھی گریز نہیں کرتے۔ الفردوس کی منڈلیوں میں انور اور نجمہ کے معاشقے کے چرچے ہونے لگے۔ انور نے الفردوس پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب اُس نے نجمہ کی خاطر اسے کافی ہاؤس میں ملنا بھی چھوڑ دیا۔ نجمہ نے انور سے کہا۔

"آخر جب ہمارے دلوں میں چور
نہیں تو ہم لوگوں سے کیوں ڈرتے
پھریں۔ ہمیں دنیا کے سامنے ہتھیار
نہیں ڈالنے چاہئیں۔"

انور کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ نجمہ بڑی بہادر لڑکی ہے اور اس قسم کے معاملوں میں لوگوں کی کبھی پروا نہیں کرے گی۔ پھر بھی وہ اس کی اس سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے نجمہ کو منع کر دیا۔

"نہیں نجمہ! تمہیں اب مجھ سے ملنے کافی
ہاؤس نہیں آنا چاہیئے ہم کتنے ہی باغی
کیوں نہ بن جائیں۔ مگر لڑکی کے معاملے
میں ہم ہمیشہ رجعت پسند رہیں گے اور
ہمیں سوسائٹی کی بلکہ تمدن کی بعض ..
پابندیوں کا ہر حال میں خیال رکھنا ہی
پڑتا ہے۔"

نجمہ نے کہا۔

"یہ اعترافِ شکست ہے۔"

انور ہنس پڑا۔

"مجھے فلمی ہیرو بنانے کی کوشش
نہ کرو۔ ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا
بہتر یہی ہے کہ ہم کسی اور جگہ ملا کریں۔"

چنانچہ اس ملاقات کے بعد انور اور نجمہ نے کافی ہاؤس اور یونیورسٹی میں ملنا جلنا ترک کر دیا۔ اب وہ دونوں ہر تیسرے دن ایک مقررہ وقت پر ایک مقررہ جگہ پر ملتے اور وہاں سے کبھی سٹیشن کی طرف اور کبھی دریائے راوی کی طرف نکل جاتے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ نجمہ پردہ نہیں کرتی تھی اور اُسے بڑی آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف تشکک پسند اور جنگل پرست ہمایوں نے نجمہ کی بھدی ناک اور چپٹے ہونٹوں والی بدصورت سہیلی عابدہ سے محبت کی پینگ بڑھالی تھی ہمایوں بدصورتی کا دیوانہ تھا۔ اس کے خیال میں حسن بدصورتی کا تنا ہے۔ اگر یہ تنا نہ ہو تو خوبصورتی کی شاخیں کبھی نہ پھوٹیں اور ان شاخوں پر نازک پھول کبھی نہ مسکرائیں عابدہ جو بڑی طرحدار اور دماغ والی لڑکی بنی پھرتی تھی ہمایوں کی باتوں میں ایسی آگئی کہ بس اُسی کے نام کی مالا جپنے لگی۔ ہمایوں اُسے خوب مال روڈ کے ہوٹلوں میں گھماتا پھرا کرتا۔ عابدہ نے اپنی محبت کا ذکر نجمہ سے بھی کر رکھا تھا۔ شروع شروع میں یہ دونوں جوڑے اکٹھے ہی ملا کرتے۔ دونوں سہیلیاں ایک خاص وقت پر آتیں اور اپنے اپنے چاہنے والوں کے ساتھ ہوٹل کے کیبنوں میں آکر بیٹھ جاتیں۔ ایک کیبن میں انور نجمہ سے باتیں کر رہا ہوتا اور دوسرے کیبن میں ہمایوں عابدہ کو لئے اُسے جمادات اور نباتات کی اصل حقیقت پر لیکچر دے رہا ہوتا۔ ایک بار اُس نے عابدہ کی بھدی ناک پر انگلی پھیر کر کہا۔

"علم الابدان کی رُو سے ناک جسم کا بڑا
معتبر حصّہ ہے اور اسی علم کی رُو سے

بھدی ناک فراخدلی کا مظہر ہوتی ہے۔
ایسی ناک محبت اور ایثار کے جذبات
سے لبریز دل کی نمائندگی کرتی ہے۔
اس پر اگر ہونٹ بھی چوڑے ہوں تو گویا
سونے پر سہاگہ سمجھو۔ عورت کے ہونٹ
چوڑے ہونے چاہئیں۔ چپٹے ہونے
چاہئیں۔ باریک ہونٹ تو خودغرض اور
چالاک لوگوں کے ہوتے ہیں۔ ہونٹ
عورت کا دروازہ ہوتے ہیں اور دروازے
کو ہمیشہ کھلا اور فراخ ہونا چاہیے۔

عابدہ نے بڑی سی پیسٹری منہ میں ڈالتے ہوئے پورا منہ کھول کر کہا۔

"لیکن گھر کا دروازہ کھلا ہو تو چوروں کا
ڈر بھی تو رہتا ہے۔"

ہمایوں نے پائپ میں دبا دبا کر تمباکو بھر کر کہا۔

"علم الاقتصادیات کی رو سے چور معاشی
زبوں حالی کا نشان ہیں۔ ویسے بھی ہر شریف
آدمی میں ایک چور اور ہر چور کے اندر ایک
شریف آدمی چھپا ہوتا ہے۔ تم مجھے کیا
سمجھتی ہو؟"

"شریف آدمی۔"

"بس مجھ سے خبردار رہو۔ کوئی پتہ نہیں
میں کب تمہارے گھر میں سیندھ لگا لوں
اور تمہارا سارا مال اسباب لوٹ کر لے

جاؤں۔"

عابدہ ہنسنے لگی۔ اس کے پیلے پیلے دانت ہمایوں کو بڑے بھلے لگے۔

"میں چاہتا ہوں تم اسی طرح اپنے
بدنما دانتوں کی نمائش کرتی رہو۔ ہنستی رہو
اور ہنستی رہو۔ تمہارے ٹیڑھے میڑھے
بدصورت دانت دیکھ کر مجھے جنگلوں میں
اُگے ہوئے خودرو درختوں اور جھاڑیوں
کا خیال آتا ہے۔ تم یقیناً دن میں دو بار ٹوتھ
پیسٹ کرتی ہو گی لیکن ٹوتھ پیسٹ تمہارا
کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم اگر تیزاب سے بھی
دانت مانجھو تو ان دانتوں پر کوئی اثر نہیں
ہو گا۔ یہ دانت مگرمچھ کی ریڑھ کی ہڈی کے
بنے ہوئے ہیں۔"

عابدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آپ تو عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں
آپ کتنے اچھے ہیں۔"

ہمایوں نے عابدہ کی موٹی ناک کو انگلیوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے
کہا۔

"تم بھی کتنی اچھی ہو۔ حسن کو ہمیشہ زوال
ہے عابدہ مگر تمہیں کبھی زوال نہیں۔
تمہاری ناک اس سے زیادہ کیا بگڑے گی
تمہارے ہونٹ اس سے زیادہ اور کیا
چپٹے ہوں گے۔ تمہارے دانت اس سے

زیادہ اور کیا خراب ہوں گے۔ تم امر
ہو۔ تم لافانی ہو۔ تم مشہور شاعر فانی سے
بھی دو قدم آگے ہو۔ تم بھاکڑہ ننگل ہو۔
تم منگلا ڈیم ہو گڈو بیراج ہو۔ تمہاری
مضبوطی اور استحکام مسلّم ہے۔"

عابدہ نے بکری کی طرح ہمایوں کی بغل میں منہ مارتے ہوئے کہا۔

"پھر مجھ سے شادی کب کرو گے؟"

ہمایوں پر جیسے بھاکڑہ ننگل کا ایک گارڈر گر پڑا۔

"کیسی دقیانوسی بات کر رہی ہو۔ شادی
کیا ہے۔ شادی فارسی زبان کا لفظ ہے
اس کا مطلب ہے دو انسانوں کا ایک
جگہ خوش ہو کر مل بیٹھنا۔ جب تم مجھ سے
اور میں تم سے خوش ہوں تو شادی کی کیا
ضرورت ہے۔ شادی کا تو سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ اور پھر جنگل میں رہتے ہوئے
انسان نے کبھی دوسرے سے شادی نہیں
کی تھی۔ وہ جس عورت کو چاہتے اٹھا لاتے
اور اُسے اپنے پاس رکھتے۔ اُن دنوں
عورتیں بڑی دلبر ہوا کرتی تھیں۔"

عابدہ نے چوتھی پیسٹری چٹ کرتے ہوئے کہا۔

"فلسفی صاحب! وہ زمانے اب نہیں
رہے۔ اب آپ ریچھ کی کھال پہن کر
اور گُرز ہاتھ میں لے کر مال روڈ کے

بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر عورتوں کا
شکار نہیں کر سکتے۔ وہ جنگلی دَور ختم ہو چکا۔
اب تو آپ کو دفتروں میں دن بھر چکی
پیس کر رات کو بیوی کو روٹی کھلانی ہے
اب آپ جس لڑکی کو اٹھا کر لائیں گے
اس سے شادی کر کے ہی رہ سکیں گے۔"

ہمایوں نے بال نوچ لئے اور مُکا ہوا میں لہرا کر بولا۔

"اس سے بڑھ کر انسان کی بدقسمتی اور
کیا ہو سکتی ہے۔ یہی تو میں بھی کہتا ہوں
کہ انسان نے اپنے آپ کو خود ہی ذلیل
کر لیا ہے۔ اُس نے جنگل میں اپنی آزادی
کو کھو کر سنگین چار دیواری میں آ کر غلامی کا
جُوا پہن لیا ہے۔ آہ جنگل! کہاں ہے
جنگل؟ پھلوں، پھولوں، درختوں، چشموں
آبشاروں اور وحشی درندوں اور وحشی عورتوں
سے بھرا ہوا جنگل! عابدہ! چلو، ہم
جنگل کو لوٹ چلیں۔"

عابدہ نے انگلی ہونٹوں میں داب لی۔

"اوئی اللہ! میں تو جنگل میں کبھی نہ
جاؤں۔"

"فکر نہ کرو۔ تمہیں جنگل میں کوئی کچھ نہیں
کہے گا۔ ہر جانور تم سے یوں پیار کرے
گا جیسے تم اُن ہی میں سے ہو۔"

"نہ بابا! میں تو کبھی جنگلوں میں نہ جاؤں۔
وہاں جائیں میرے دشمن۔"

ہمایوں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

"تو پھر آؤ اور میرے سینے سے لگ جاؤ
اپنی بھدّی ناک میری ناک سے اور اپنے
چپٹے فٹ پاتھ جیسے ہونٹ میرے
ہونٹوں سے لگا دو۔"

عابدہ اچھل پڑی۔

"اوئی اللہ! میں نہیں۔"

ہمایوں بھی اچھل پڑا اور اس نے اچھل کر عابدہ کو دبوچ لیا۔ تھوڑی دیر بعد عابدہ ہمایوں کی آغوش میں تھی اور وہ جنگلی چیتے کی طرح قدیم جنگلوں میں پاگل ہو کر خرخر کرتا پھر رہا تھا۔ عابدہ نے ایک بار تو اس قدر زور سے ہمایوں کا بوسہ لیا۔ کہ ہمایوں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

٦

انور کو سمن آباد میں دو کمرے مل گئے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور میکلوڈ روڈ والی بلڈنگ سے اپنا سامان اٹھایا اور سیدھا سمن آباد آ گیا۔ جب وہ متھرا والے بڑے میاں سے مل کر رخصت ہونے لگا تو صدیقہ بی بی کواڑ کے عقب میں کھڑی پُرنم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انور نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے پرنام کیا اور نیچے تانگے میں آ کر بیٹھ گیا۔ ملازم سامان لے کر پہلے ہی سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ دو کمرے اگرچہ اتنے لمبے چوڑے اور کشادہ نہیں تھے لیکن میکلوڈ روڈ والے کمروں سے بدرجہا بہتر تھے۔ اور پھر کھلی فضا میں شہر کے ہنگاموں سے دور پُرسکون جگہ پر واقع تھے۔ اصل میں یہ تین کمروں کا کوارٹر نما مکان تھا جس کے ایک کمرے میں مالک مکان نے اپنا سامان بند کر رکھا تھا۔ سامنے ایک فٹ پاتھ ایسا لان تھا اور عقب میں ایک صحن بھی تھا۔ انور نے ایک کمرہ تو بیٹھنے سونے اور لکھنے پڑھنے کے لیے مخصوص کر دیا اور دوسرے کمرے کو جس کی کھڑکیاں باہر کھیتوں کی طرف کھلتی تھیں اپنا سٹوڈیو بنا لیا۔ اس کمرے میں بیٹھ کر وہ کمرشل کام کرتا۔ سلائیڈیں، ڈیزائن پبلسٹی کارڈ اور پوسٹر وغیرہ بناتا اور ساتھ ہی ساتھ تصویریں بھی پینٹ کرتا۔

اس کمرے میں دنیا جہان کا کاٹھ کباڑ جمع کر دیا گیا تھا۔ پرانی گرد آلود تصویروں کے کینوس، لکڑی کے فریم، ٹوٹے ہوئے برش، رنگوں کے خالی ڈبے ڈبیاں، ایک میل خورہ، پرانی چوڑی میز جس پر رنگ جمے ہوئے تھے۔ دو تین سٹول، ایزل، ایک بید کا صوفہ جس کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا اور ایک جگہ سے بید بھی ادھڑا ہوا تھا دو آرام

کرسیاں جن پر کینوس کا انبار لگا رہتا۔ کونے میں نیلام گھر سے خریدا ہوا ایک پرانا دیوان پڑا تھا۔ اس دیوان میں دو تین جگہوں سے روئی باہر نکلی ہوئی تھی۔ انور نے اس دیوان کی بدنمائی کو کم کرنے کی کوشش میں اس پر ایک سرخ رنگ کی چادر بچھا دی تھی۔ دیواروں میں کیل ٹھونک کر مختلف سائز اور مختلف رنگوں کی فریم کی ہوئی اور فریم کے بغیر تصویریں لٹکا دی گئی تھیں غرضیکہ یہ کمرہ ایک ایسے آرٹسٹ کا پورا پورا کمرہ بن گیا تھا جس کی تصویروں کو کوئی اہمیت نہ دی جا رہی ہو۔

ویسے بھی ہمارے ہاں ابھی تصویروں یعنی پینٹنگز کو کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی، کیونکہ ایک تو ہمارے ہاں پینٹنگز کی روایت کوئی نہیں۔ یہاں مصور اس کو کہا جاتا ہے جو شراب پلاتی ہوئی ساقی عورت کی ایرانی انداز میں تصویریں بناتا ہے یا پنسل سے خانے لگا کر آتا ترک، اقبال اور سرسید کی چھوٹی تصویروں کی بڑی نقل تیار کرتا ہے۔ یا پھر وہ رنگساز ہیں جنہیں پینٹر کہا جاتا ہے اور جن کا کام بورڈ لکھنا، سینما کے بورڈ تیار کرنا اور فرصت کے اوقات میں ایسی سینریاں بنانا ہے جن میں نہر کے ساتھ ساتھ کھمبوں پر بجلی کے قمقموں کی قطاریں چلی جاتی ہیں جن کے درختوں پر سلمے ستارہ کی سجاوٹ کی جاتی ہے۔ اس قسم کی سینریاں عام طور پر گرم حماموں اور نسواڑ کی دکانوں کی زینت ہوا کرتی ہیں۔

تیسرا نمبر ان پینٹروں کا آتا ہے جو ایرانی لکیروں کی پیروی میں نقاشی کرتے ہیں اور مغل دربار یا چھوٹ عہد کے تتبع میں نازک اندام مردوں اور عورتوں کی تصویریں بناتے ہیں شکار گاہوں کی تصویریں بناتے ہیں جن تصویروں میں کہ عام طور پر گہرائی، گیرائی، فاصلہ وغیرہ کا بالکل خیال نہیں رکھا جاتا۔ ہندوستان میں اگر تصویر کشی کی روایت کہیں ملتی ہے تو وہ بنگال سکول ہے۔ یہ سکول ابھی تک اپنے انداز میں کام کر رہا ہے۔ بلکہ بعد میں امرتا شیر گل ایسی زندگی سے بھرپور تخلیقی فنکارہ بھی ہیں اسی اسکول کی پیروی کرتی دکھائی دیتی ہے پنجاب کو پینٹ کرنے والوں نے اکثر و بیشتر اُسے تصنع آمیز چابک دستی سے پینٹ کیا ہے یونیورسٹی کے کمروں میں بیٹھ کر ضلع جھنگ کے بیلوں کی نقشہ کشی کرنے والے فن کاروں کی تصویروں میں بھینس کی شکل بھی اصلی بھینس سے نہیں ملتی۔ دیہاتیوں کو سمجھنا اور انہیں ان

کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ کینوس پر لانا تو خیر بڑی دور کی بات ہے۔ یہ ماڈل پینٹنگ ہے اور شوقیہ تصویر کشی ہے اور اسے ہم فیشن ایبل فن کاری کہہ سکتے ہیں۔

اس کے بعد مصوروں کی اس ٹولی کا نمبر آتا ہے جو قدیم ہندی سنگ تراش اور مصوری سے بے خبر ہیں سبھاؤ مغربی روایات سے متاثر ہیں اور انہیں کے انداز میں تصویریں بناتے ہیں۔ ان لوگوں کے وہاں کے مشہور کیوبسٹ اور موڈیلسٹ مصوروں کے برخلاف فائن پینٹنگ کبھی نہیں کی ہوتی اور پہلے ہی روز برش کے اُلٹے سیدھے ترچھے اُلٹے پھیرے سے [illegible] بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی کرب انگیزیوں اور اس کے خوفناک حقائق سے کوسوں دور رہتے ہیں یہ ڈرائنگ روم کے مصوروں اور ڈرائنگ روم میں تنہا ان لوگوں کی تصویریں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائیں گی۔ گوگین کے عہد [illegible] وہ لوگ ان نام نہاد مصوروں سے [illegible] تصویریں بنایا کرتے تھے یہ لوگ خود ساختہ ہیں لیکن فن خود ساختہ کبھی نہیں ہوتا۔ فن کی [illegible] جگر کی قربانی پیش نہ کی جائے اس دیوتا کے چہرے پر تخلیق [illegible] بہرحال ان لوگوں کا اتنا کردار ضرور ہے کہ یہ آنے والے دور کے لیے ایندھن کا کام دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کے بعد یہاں مصوری کی ایک باقاعدہ روایت جنم لے گی۔ اس روایتی دور کے بعد تجرباتی دور آئے گا اس دور کے بعد یہاں [illegible] ایسے پائے کے پینٹر جنم لیں گے

انور کو بھی اچھی طرح علم تھا کہ وہ اس بھٹی کا ایندھن ہے جس کے اوپر سو سال کے بعد پک کر تیار ہونے والی ہنڈیا رکھی ہوئی ہے۔ لیکن وہ اپنے ہی کردار سے خوش تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے اپنے کردار کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک آرٹسٹ تھا۔ وہ محسوس کرتا بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ وہ تجربات کے ایک طویل دور میں سے گزرا تھا اور گزر رہا تھا۔ زندگی نے اُسے اپنی دہکتی ہوئی بھٹی میں بڑی بے رحمی سے دھکیل دیا تھا۔ وہ کئی کئی دن دیارِ غیر میں بھوکا رہا تھا۔ اس نے ہر قسم کے کام کیے۔ تھے۔ ہر قسم کے لوگوں میں غربت، افلاس اور تنگ دستی کے عالم میں رہا تھا۔ ہر قسم کے لوگوں

سے ملا تھا اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ نیشنل آرٹس کالج میں اُس کے سوا اور کوئی طالب علم ایسا نہ تھا جس کو زندگی نے اتنے دھکے دیئے ہوں، جسے زندگی نے اتنی چھوٹی عمر میں اتنا کچھ سکھا دیا ہو۔

انور نے ان باتوں پر کبھی اپنے آپ کو اہمیت دینے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ اپنی حیثیت سے بالکل مطمئن تھا۔ اسے کسی سے اگر کچھ غرض تھی تو صرف اپنے فن سے اور ان ہستیوں سے جو اُس کے فن سے کسی نہ کسی طریقے سے وابستہ تھیں۔ اس نے کبھی کسی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ اُن پر اپنے نظریات ٹھونستا پھرے یا اُن کے ساتھ دماغ سوزی میں اپنا وقت ضائع کرے۔ ہوٹل الفردوس میں اس کے دوستوں کے درمیان ہر قسم کی بحثیں ہوا کرتیں لیکن وہ ہمیشہ بے تعلق رہتا۔ اور کبھی کسی بحث میں حصہ نہ لیتا۔ ان معنوں میں وہ بڑا باعمل قسم کا آدمی تھا۔ وہ محبت پر بحث کرنے کی بجائے محبت کرتا۔ نفرت پر بحث کرتے رہنے کی بجائے وہ نفرت کرنے کو ترجیح دیتا۔ اُسے نہ تو اکبر کے اقبالی فلسفے سے کوئی غرض تھی نہ یوسف کی خدا پرستی سے سروکار تھا۔ وہ نہ تو سعید کی دہریت سے متاثر ہوتا اور نہ ہمایوں کی تشکک پسند نظریات سے کبھی اُلجھنے کی کوشش کرتا۔ وہ عورتوں، صحت مند جسم والی عورتوں کو پسند کرتا، انہیں قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا۔ سفر اور ملک ملک کی آوارہ گردی کے موقعہ کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ دوستوں کی محبت سے لطف اٹھاتا۔ دوستوں کی عدم موجودگی میں کبھی انہیں یاد نہ کرتا۔ ہر حال میں مطمئن رہتا اور ایک اپنے ہی خون، اپنے ہی تجربات، اپنے ہی پُرجوش فن اور اپنے ہی خیالات کے نشے میں مگن رہتا۔

سمن آباد والے سٹوڈیو کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب انور نجمہ کو وہاں بڑی آسانی سے بُلا سکتا تھا۔ یہاں اُسے دوستوں کا کھٹکا نہیں تھا۔ ویسے بھی اُس کے کوارٹر کے آس پاس لوگوں کے مکان نہیں تھے۔ یہ کوارٹر ایک سوکھے ہوئے تالاب کے کنارے آباد تھا۔ اور یہاں سے آدھ فرلانگ کے فاصلے پر جاکر آبادی شروع ہوتی تھی۔

تاہم احتیاطاً انور نے نجمہ کو برقع اوڑھا دیا۔ نجمہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اپنی ایک

سہیلی کے گھر جاتی۔ وہاں اس کا برقع پہنتی۔ اور تانگے میں بیٹھ کر انور کو ملنے اس کے سٹوڈیو آجاتی۔ انور کے پاس وہ روزانہ تین چار گھنٹے بسر کرتی۔ اس کے لیے چائے اور کبھی کبھی دوپہر کا کھانا تیار کرتی۔ اس کے کپڑوں کو استری کرتی۔ نوکر سے اس کا کمرہ صاف کرواتی۔ کتابوں وغیرہ کو سلیقے سے لگاتی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ انور کی بیوی بن جاتی اور سارے گھر پر ایک روپ اور روحانی فضا سی چھا جاتی۔ انور کبھی نجمہ کو کسی کام سے منع نہیں کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نجمہ کی خوشی اسی میں ہے اور وہ اس کی خوشی کے راستے میں بے جا تکلف کر کے دیوار نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ نجمہ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے بڑے شوق سے پیتا، فرنچ ٹوسٹ بڑے مزے لے لے کر کھاتا۔ اسے خود جیب سے رومال نکال کر دھونے کے لیے دیتا۔ اور جب وہ سب کام سے فارغ ہو کر سٹوڈیو کا دروازہ کھٹکھٹاتی تو انور جلدی سے کپڑے پہن لیتا۔ دروازہ کھولتا اور نجمہ کو گلے لگا لیتا۔ پھر وہ اسے جی بھر کر پیار کرتا۔ اس کا منہ چومتا، گردن چومتا، رخسار چومتا، اور چومتا جن میں سے سنلائٹ صابن کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو آرہی ہوتی۔ پھر وہ سٹوڈیو کے لوٹتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر جی بھر کر باتیں کرتے پیار کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر قہقہے لگاتے اور مستقبل کے پروگرام بناتے۔ کافی بنا کر پیتے۔ اس کے بعد نجمہ برقع اوڑھتی انور اسے لپٹا کر الوداعی پیار کرتا۔ اور وہ بس میں سوار ہو کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتی۔

انور نے نجمہ کے ان گنت سکیچ بنائے تھے۔ اس نے اُس کے دو پورٹریٹ بھی بنائے تھے۔ ایک پینسل میں اور دوسرا آئیل میں۔ ان تینوں تصویروں میں انور نے نجمہ کے چہرے پر اس کی گھریلو اور ایثار پیشہ شخصیت کے نقوش کو نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی یہ بات اس کے تجربے میں آئی تھی کہ اونچے لمبے اور بھرے بھرے متناسب قسم کی عورت میں بیوی، ماں بہن بننے کی اہلیت ہمیشہ معمول سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی عورتیں نسائیت کے ہر روپ کو پورے رنگوں کے ساتھ اجاگر کرتی ہیں۔ نجمہ میں بھی یہ بات بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ انور اب نجمہ کی ایک عریاں تصویر بنانا چاہتا تھا۔ جس کے لیے وہ موزوں وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ ابھی تک اُس نے نجمہ کو نفسیاتی طور پر آمادہ نہ پایا تھا۔ نجمہ کو اتنا معلوم تھا کہ انور کپڑے اتار کر تصویریں بناتا ہے اور وہ ... اُسے نفسیات کی طالبہ

ہونے کی حیثیت سے انور کی جنسی تشنگی پر محمول کرتی تھی۔ مگر حقیقت ایسی نہ تھی۔ انور اس طرح جنسی سیرابی نہیں بلکہ ایک طرح کی جنسی فرحت محسوس کرتا تھا۔ جس طرح عورت بچہ جننے کے بعد ایک قسم کا نسائی فخر محسوس کرتی ہے اور عورت پن کے عروج پر ہوتی ہے۔ اسی طرح انور ننگا ہو کر جب تصویر بنا رہا ہوتا تو اپنے آپ کو فن کے انتہائی مقام پر محسوس کرتا۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ باغِ عدن کے کسی کونے میں گلاب کی بیلوں کے درمیان بیٹھا ہے اور ازلی اور ابدی انسان کی خوشیوں، اس کے دکھوں، اس کے ملال اور پچھتاوے کو بیان کر رہا ہے۔

ایک روز نجمہ انور سے ملنے آئی تو بارش ہونے لگی۔

سردیاں بیت رہی تھیں۔ بارش کی وجہ سے ٹھنڈ زیادہ ہو گئی۔ گھرے گھرے بادل آسمان پر چھا گئے۔ موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ انور نے سٹوڈیو میں دو ہیٹر گرم کر لیے۔ کمرہ گرم حمام بن گیا۔ نجمہ نے سویٹر اتار دیا۔ دونوں نے مل کر کافی بنائی۔ بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور کافی کے دَور کے ساتھ خوبصورت محبت بھری گرم باتوں کا دَور شروع ہو گیا نجمہ ایک پڑھی لکھی پُراعتماد لڑکی تھی اور انور ایک ذمہ دار عالی ظرف آدمی تھا۔ جب کبھی وہ ایک دوسرے کی آغوش میں بڑے مزے سے میاں بیوی کی طرح بیٹھے ہوتے تو جوانی اور اندھے جذبات انہیں ہر قدم پر ڈگمگانے کی سعی کرتے لیکن انور کبھی اس طرف دھیان نہ دیتا۔ انور کوئی پرہیزگار اور پابندِ صوم و صلوٰۃ آدمی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ایک ذمہ دار آدمی تھا۔ اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنی ذرا سی لغزش سے کسی لڑکی کی زندگی ہمیشہ کے لیے خراب کر دے وہ عورت کے جسم کا متوالا تھا۔ وہ بمبئی میں چھپ چھپ کر غسل خانے میں نہاتی عورتوں کو دیکھا کرتا تھا اور آج بھی وہ اس قسم کی باتوں سے پرہیز کرنا کفر سمجھتا تھا۔ لیکن اس نے ہر بات کی ایک حد مقرر کر رکھی تھی۔ اپنے ہر قسم کے جذبات سے ایک سمجھوتہ کر رکھا تھا۔ وہ اس حد سے نہ تو خود کبھی آگے بڑھتا تھا اور نہ اپنے جذبات ہی کو ایک قدم آگے اٹھانے دیتا تھا

اسے نجمہ کا جسم بے حد پسند تھا۔ بلکہ وہ اس کے جسم کی وجہ سے ہی اس کی طرف

کھچا تھا۔ وہ اس کے جسم کو بالکل عریاں حالت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اس جسم کا احترام کرتا تھا۔ وہ اس جسم کو اپنے گھٹیا جذبات کا شکار نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس جسم کو وہ ایک آرٹسٹ کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا جس طرح کسان کھیت کنارے بیٹھ کر اپنے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھتا ہے۔ اس خوبصورت جسم کو مرد کی آنکھ سے دیکھنے کے لیے وہ شادی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہی جذبات جو اس وقت سفلے اور محض حیوانی ہیں، شادی کی رات اعلیٰ اور خالص انسانی ہوں گے کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ہم کسی عورت کے پاس اس کی باقی ماندہ زندگی یا اس کے ساتھ اپنے فعل کے نتائج کی ذمہ داری لیے بغیر رات بسر کرتے ہیں تو ہم معاشرے کے ایک انتہائی اہم قانون اور اپنے ضمیر کو دھوکا دیتے ہیں۔ پھر لذت کی ایک رات ہماری زندگی پر ندامت کی تیز اور کبھی ختم نہ ہونے والی دوپہر بن کر چھا جاتی ہے۔ ہم لاکھ کند ذہن اور مُردہ ضمیر کیوں نہ ہوں مگر اس کانٹے کی کھٹک پتھر میں بھی چھید ڈال دیتی ہے۔

انور کا ذہن اس قسم کا بن چکا تھا کہ اُسے عورت کو دیکھ کر کبھی زنا کا خیال ذہن میں پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ عورت کو خدا کی صفتِ خلاقی کا سب سے بڑا امین سمجھتا تھا اور اُسے ہمیشہ محبت بھری اور عقیدت بھری نظروں سے دیکھتا جیسے ناشپاتی کا ایک عظیم درخت جو بہار میں سفید سفید شگوفوں سے لدا ہوا ہو۔

اس روز بارش ہونے لگی تو کمرہ انور نے ہیٹر جلا کر گرم کر لیا جس سے وہاں دلگداز فضا طاری ہو گئی۔ بارش، گرم کمرہ، خوبصورت عورت، کافی سے بھری ہوئی کیتلی اور بہترین سگریٹ ——— یہ جنت تو کشمیر سے بھی بڑھ کر ہے۔ بلکہ پھر آدمی کو کشمیر یا جنت میں جانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انور کے ذہن میں مہاراشٹر اور بنگال کی بارشوں کا خیال آ گیا۔ اس کے دماغ میں بے شمار خوبصورت تصویریں گھوم گئیں۔ اسے ایملی برونٹے اور شارلٹ برونٹے کے ناولوں کے مناظر یاد آنے لگے۔ اس نے کافی کا ایک گھونٹ پیا۔ سگریٹ سلگایا۔ میز پر رکھے ہوئے شکستہ گلدان میں سے نرگس کا ایک پھول ڈنٹھل سمیت نکالا اور اسے نجمہ کے بالوں میں سجانے لگا۔

"اب یہ پھول کبھی نہیں مرجھائے گا۔"
نجمہ ذرا شرما سی گئی۔

"اسے آپ جو سجا رہے ہیں۔"
"نہیں نجمہ! یہ بات نہیں۔ یہ گھڑی ہی بڑی
مبارک ہے۔ اس وقت جو کوئی بھی پھول
اٹھا کر کسی بھی عورت کے بالوں میں سجائے
گا وہ پھول سدا ترو تازہ رہے گا۔"
نجمہ نے کھڑکی کے شیشوں میں سے گرتی بارش کو دیکھ کر کہا۔
"اب سردی بڑھ جائے گی۔"
"ہاں!"
انور نے بھی باہر دیکھتے ہوئے کہا۔
"اب سردی بڑھ جائے گی۔ جاڑے کی
بارش جنگل میں لیٹی ہوئی نیلے رنگ کی عریاں
عورت ہے۔ یہ عورت دھرتی پر پھول اگاتی
ہے۔ پھولوں میں خوشبو پیدا کرتی ہے۔ اور
جس درخت کو بوسہ دیتی ہے وہ شگوفوں
سے ڈھک جاتا ہے۔ گلیوں میں مکانوں
کے پیچھے اس جنگل کی مہارانی کی آمد پر جلترنگ
بجاتے ہیں۔ جنگل میں پہاڑوں کے
چشمے اور جھیلوں کے جھرنے شور مچاتے ہیں
گنجان درختوں کی جھولتی ٹہنیاں بارش کے
موتی پروتی ہیں۔ بل کھاتی ندیاں جھاڑیوں
کی چھتریاں اوڑھ کر سہم جاتی ہیں۔ نازک اندام

ہرنیاں اپنی اپنی گپھاؤں میں بچوں کو سینے
سے لپٹا لیتی ہیں۔ گرم لحافوں میں بچے اپنی
ماؤں سے چمٹ جاتے ہیں۔ سردیوں کی
بارش بڑی خواب انگیز ہوتی ہے نجمہ!"

انور نے نجمہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ نجمہ پر ایک بڑی سحر انگیز سی کیفیت طاری ہو گئی۔
جس میں بارش کے علاوہ انور کی جادو بھری باتوں کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ اس کا حلق خشک
ہو گیا اور دل دھڑ دھڑ دھڑکنے لگا۔ باہر بجلی زور سے کڑکی۔ ساتھ ہی بادل گرجا۔ نجمہ انور سے
لپٹ گئی۔ انور نجمہ کے کندھوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ نجمہ کی حالت بالکل اس بلی کی سی ہو
رہی تھی جو اپنے مالک کی گود میں جا کر بڑے آرام سے بال پھلا کر خر خر کرنے لگتی ہے۔ نجمہ
انور کی آغوش میں گرتی ہی چلی گئی۔ نفسیات کی تمام کتابیں علم اسے کا سارا انصاب جاڑے کی
بارش میں حباب بن کر بہنے لگا۔ پہلے جب انور اس کی گردن پر ہاتھ لے جاتا تو وہ اس کا ہاتھ
پکڑ لیتی تھی۔ لیکن اب اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے انور کے سامنے مزاحمت ترک
کر دی۔ انور یکدم چونک سا اٹھا۔ وہ عورت کی کمزوری کو بخوبی جانتا تھا اور اس کمزوری سے وہ
وہ ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا بارش اور اس کی باتوں کے اثر سے
دیوانی ہو گئی لڑکی جب بارش رکنے کے بعد ہوش میں آئے گی تو ایک بالکل ہی دوسری عورت
ہو گی۔

اچانک انور نے نجمہ کے کان میں کہا۔
"نجمہ! میں تمہاری ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں۔"
نجمہ کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے خواب آلود آواز میں کہا۔
"وہ تو آپ بنایا ہی کرتے ہیں۔"
"نہیں نجمہ! یہ مختلف تصویر ہو گی۔"
"وہ کیسے!"
"یہ عریاں تصویر ہو گی۔"

نجمہ کے سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اسے عورت کا خیال آگیا جو بارش کے درمیان جنگل میں ننگی لیٹی تھی۔ اس نے انور کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔ انور نے اس کی خوشبودار انگلی چوم لی۔

"ہاں نجمہ! میں تمہاری ایک عریاں تصویر کا
سکیچ لینا چاہتا ہوں۔ یہ تصویر میری زندگی کی
بہترین تصویروں میں سے ہوگی۔"

"لیکن یہ کیسے بن سکتی ہے؟"

"اس کے لیے تمہیں تھوڑی دیر کے واسطے
کپڑے اتار کر اس دیوان پر لیٹنا ہوگا۔"

اچانک نجمہ کو جیسے کسی نے جھنجوڑ کر جگایا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! بھلا میں ایسا کر سکتی
ہوں؟ میں تو شرم سے خودکشی کر لوں گی۔ توبہ!
میں تو مر جاؤں گی۔"

انور نے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہا۔

"نجمہ! تم پڑھی لکھی لڑکی ہو ـــــ تم آرٹسٹوں
کی مشکلات کا بخوبی اندازہ کر سکتی ہو۔ میں تمہارا
ہی نہیں تمہارے جسم کا عاشق بھی ہوں۔ میں
تمہاری ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ یہ تصویر
میری زندگی کی آئیڈیل تصویر ہوگی۔ کیونکہ
تمہارا جسم آئیڈیل جسم ہے اور تم ایک آئیڈیل
عورت ہو۔ اور میری زندگی کا آدرش تم
ایسی عورتوں کو پینٹ کرنا ہے اگر تم مجھے سمجھنے
اور مجھ سے تعاون کرنے کی کوشش نہ کرو

گی تو پھر مجھے کس سے امید ہو سکتی ہے۔"

"نہیں نہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔"

"آخر کیوں؟"

"مجھے شرم آتی ہے۔"

"کس سے؟"

"آپ سے۔ اپنے آپ سے۔"

انور نے نجمہ کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

"نجمہ! اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ میں
تمہارا ہوں۔ تم میری ہو۔ بھلا ایک دوسرے
سے کیا پردہ۔ پھر یہ فن ہے یورپ میں
ہزاروں لڑکیاں ـــــ"

نجمہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"یورپ کی لڑکیوں کو وہیں رہنے دیجیے ہمارا
ماحول ان سے بالکل مختلف ہے۔"

"تو پھر تم زندگی کے دوسرے شعبوں میں
یورپین بننے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟ جب
مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب تو پھر
تم یورپ کی طرف کیوں بھاگتی ہو؟"

"میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔"

"تمہاری دوسری بہنیں تو ایسا ہی کرتی ہیں۔"

"میں ان کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔"

"لیکن تم میری مدد تو کر سکتی ہو۔ تم مجھ سے
تعاون تو کر سکتی ہو۔ آخر اس میں برائی کیا ہے؟"

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں شرم سے بے ہوش ہو جاؤں گی۔"

"میں تمہارے ان ہی جذبات کی تو عکاسی کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایسا ماڈل تو سارے یورپ میں کہیں دستیاب نہیں ہو سکتا۔ میں یہی تو ان لوگوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ جب مشرقی دنیا میں نیوڈ تصویر بنتی ہے تو اس میں برف ایسی بے حسی اور ٹھنڈک کی جگہ حیا کی سرخی شرم کی تمتماہٹ اور تقدس کا ہالہ ہوتا ہے۔ اتنے بڑے موضوع کی تخلیق میں میری مدد نہیں کرو گی نجمہ!"

انور کی تمام دلیلیں اور ساری فصاحت ناکام ہو گئی۔ نجمہ عریاں ماڈل بننے پر بالکل تیار نہ ہوئی۔ بعد ازاں جب نجمہ کی انور سے شادی ہو گئی۔ جب بھی انور نے بڑی مشکل سے نجمہ کی چند نیوڈ تصویریں پینٹ کیں۔ مگر ان تصویروں میں وہ بات بالکل نہیں تھی جو ایک غیر شادی شدہ شریف لڑکی کی نیوڈ تصویر میں ہو سکتی تھی۔ ایسی لڑکی جسے احساس ہو کہ اسے عریاں حالت میں ایک مرد کی نگاہیں بار بار دیکھ رہی ہیں۔ انور نے کافی کا ایک اور پیالہ بنا کر پیا اور سگریٹ سلگایا۔ اب بارش تھم گئی تھی۔ اور صرف روشندان کے چھجوں پر رکے ہوئے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ نجمہ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"اب میں جاتی ہوں۔ بارش بھی رک گئی ہے"

"تم نے آج مجھے ناامید کیا ہے نجمہ!"

نجمہ نے انور کا ہاتھ پکڑ کر بڑی محبت سے کہا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کہیئے۔ میں بھلا آپ کی بات ٹال سکتی ہوں۔ سچ میں ایسا سوچ بھی

نہیں سکتی۔ لیکن یقین کیجیئے۔ یہ بات میرے بس میں ہی نہیں۔ میں آپ کے سامنے کپڑے اتار کر کیسے لیٹ سکتی ہوں۔ مجھے تو ایسا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"کیا میں تمہاری ایسی تصویر کبھی نہ بنا سکوں گا؟"

"آپ اس طرح کیوں سوچتے ہیں۔ آپ تصور سے کام لے کر جو چاہیں بنا سکتے ہیں۔ بخدا مجھ سے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو فوراً بے ہوش ہو جاؤں گی۔"

"پھر تم ماڈرن لڑکی بننا چھوڑ دو۔ کل سے تم سفید برقع پہنا کرو اور گھر میں بیٹھ کر سلائی کا کام کیا کرو۔ اور کھانا پکانے میں دوسروں کو مدد دیا کرو۔ کیونکہ حقیقت میں تم ماڈرن نہیں ہو تم میں اور ایک عام گھرانے کی لڑکی میں کوئی فرق نہیں۔"

نجمہ نے انور کا ماتھا چوم کر کہا۔

"میں آپ کو ایک بات بتاؤں انور صاحب! شرافت کی ایک ہی صورت اور ایک ہی شکل ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس معاملے میں ایک عام گھرانے کی لڑکیوں ایسی ہوں۔ لیکن یہ کوئی خود ساختہ شے نہیں ہے۔ اعتبار کیجیئے یہ بات میرے خون میں رچی ہوئی ہے۔ میں چاہوں بھی تو آپ کی بات پر عمل نہیں کر سکتی۔"

انور سگریٹ منہ میں لیے سٹوڈیو میں ٹہلنے لگا۔ نجمہ اٹھ کر برقع پہننے لگی۔ ایک تانگہ سواریوں کو لے کر سڑک پر گھٹنے گھٹنے پانی میں سے شڑاپ شڑاپ کرتا آگے کو گزر گیا۔ انور نے ملازم کو آواز دی اور کہا کہ وہ جا کر اس تانگے کو جو اگلے مکانوں کے باہر جا کر خالی ہو رہا تھا یہاں لے آئے۔ ملازم لڑکا سر پہ براندی ڈال کر تانگہ لینے چلا گیا۔ نجمہ نے انور کے ہاتھ کو چوم کر کہا۔

"ناراض ہو گئے کیا۔"

انور مسکرایا۔

"کبھی نہیں۔"

نجمہ بھی مسکرا اٹھی۔ اس کا چہرہ سفید پھول کی طرح شگفتہ ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ نجمہ کے بالوں میں لگے ہوئے نرگس کے پھول میں سے تر و تازہ خوشبو اٹھ رہی تھی۔

۷

آخر وہ ہو کر رہا جس کا انور کو خدشہ تھا۔

انور اور نجمہ کا سکینڈل کافی ہاؤس اور الفردوس سے نکل کر یونیورسٹی کی چار دیواری میں بھی پھیل گیا۔ اگرچہ نجمہ برقع اوڑھ کر انور سے ملنے آیا کرتی تھی لیکن دیکھنے والوں کی نگاہوں نے یہاں بھی اس کا تعاقب نہ چھوڑا۔ اڑتے اڑتے یہ بات نجمہ کے والد تک پہنچ گئی۔ نجمہ کے والد اگرچہ پرانی وضع کے بزرگ تھے لیکن چار سال یورپ میں گزار آئے تھے، اور عشق و محبت کے معاملوں کو بڑی وسیع النظری سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انہیں اپنی بیٹی کے کردار اور اپنی تربیت پر مکمل اعتماد تھا۔ اس لئے وہ خاموش ہو رہے اور اس سلسلے میں انہوں نے نجمہ سے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی۔ نجمہ سے انہیں بڑی محبت تھی۔ ایک تو وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی، دوسرے وہ اپنی مرحوم والدہ کی آخری نشانی تھی۔ دوسری طرف نجمہ ہر دوسرے روز برقع اوڑھ کر انور سے ملنے باقاعدہ سمن آباد جاتی اور اس کے پاس دو تین گھنٹے گزار کر گھر واپس آ جاتی۔

گرمیوں کا موسم گزر رہا تھا۔ برسات کی جھڑیاں ختم ہو گئی تھیں اور رات کو ٹھنڈ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ایک روز نجمہ حسب معمول انور سے ملنے آئی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ گزشتہ روز بڑے زور کی بارش ہوئی تھی۔ فضا مرطوب اور نم دار تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور سڑک پر جا بجا کل کی بارش کا پانی کھڑا تھا۔ نجمہ اور انور سٹوڈیو میں بیٹھے تھے۔ انور نے کافی بنائی اور دونوں کافی کی پیالیاں ہاتھ

میں لئے کافی پینے اور باتیں کرنے لگے۔ نجمہ نے پوچھا۔

"سنا ہے ہمایوں صاحب عابدہ سے
شادی کر رہے ہیں؟"

انور نے کہا۔

"تمہیں کس نے کہا؟"

"عابدہ کہہ رہی تھی اور وہ تو بڑی خوش
تھی۔"

انور کہنے لگا۔

"ہمایوں ایسا آدمی نہیں کہ کسی لڑکی سے
محبت کرے اور پھر شادی بھی کر لے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ ان باتوں کا قائل ہی نہیں۔"

نجمہ نے دزدیدہ نگاہوں سے انور کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور آپ ان باتوں کو مانتے ہیں؟"

انور مسکرایا۔

"تم نے بڑے نازک مقام پر آکر یہ بات
پوچھی ہے ویسے جب سے تم ملی ہو
میں ان تمام باتوں پر ایمان لے آیا ہوں۔"

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس سے پہلے انور نے کسی کار کے باہر آکر رکنے کی آواز سنی۔ اس کا خیال تھا کہ کسی کی کار خراب ہو گئی ہو گی انور نے دروازہ کھولا۔ ملازم نے کہا۔

"باہر کوئی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں
جی!"

"مجھے بلا رہے ہیں۔ انہیں اندر بٹھاؤ"

نجمہ نے پوچھا۔

"کون تھا؟"

"خدا جانے ——— میرا خیال ہے
ہمایوں ہوگا۔ مگر وہ تو سیدھا اندر آجایا کرتا
ہے۔"

انور دوسرے کمرے میں گیا تو دم بخود سا ہو کر رہ گیا۔ دوسرے کمرے میں نجمہ کے والد صاحب صوفے پر تشریف فرما تھے اور سگار پی رہے تھے۔

"تشریف رکھیئے۔"

نجمہ کے باپ نے انور کو ہاتھ کے اشارے سے ایک خالی صوفے پر بلاتے ہوئے کہا۔ انور نے جب دیکھا کہ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو اس نے اپنے حواس بجا کئے اور صوفے پر آکر بیٹھ گیا ویسے بھی انور اس قسم کے مرحلوں پر گھبرانے والا آدمی نہیں تھا۔ چونکہ یہ زندگی میں پہلا واقعہ پیش آیا تھا اس لئے اسے قدرے اچنبھا ضرور ہوا تھا۔ انور بڑے اعتماد سے نجمہ کے والد کے پاس والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ انور نے نوکر سے کہا۔

"کافی بناؤ۔"

"شکریہ! میں پی کر آرہا ہوں۔"

"ایک پیالی پی لیجئے۔ کوئی حرج نہیں۔"

اس کے بعد کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ دوسری طرف جب نجمہ نے اپنے ڈیڈی کی آواز سنی تو اس کی تو جان ہی نکل گئی۔ وہ تو نیم جان سی ہو کر دھڑکتا ہوا دل لئے صوفے پر وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔ دونوں کمروں میں ایک بوجھل اور گہری خاموشی طاری تھی۔ صرف باہر صحن میں ملازم کے برتن صاف کرنے کی آواز آرہی تھی۔ نجمہ کے ڈیڈی نے سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

"اس وقت نجمہ یہاں موجود ہے کیا؟"

انور نے کہا۔

"جی ہاں۔ ساتھ والے کمرے میں تشریف لے آیئے۔"

انور نے اٹھ کر سٹوڈیو کا دروازہ کھول دیا۔ انور اور نجمہ کا ڈیڈی اندر داخل ہوئے نجمہ دوپٹے کی بُکل مارے بید کے صوفے پر دم بخود سر جھکائے بیٹھی تھی۔ نجمہ کے ڈیڈی نے ناقدانہ نگاہوں سے سٹوڈیو کے کباڑ خانے کا جائزہ لیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اب پھر وہاں ایک بڑی گمبھیر اور کرب انگیز خاموشی طاری ہو گئی۔ نجمہ کو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ انور سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح بات شروع کرے۔ اگرچہ اُسے یقین تھا کہ آج اس بات کے آخری فیصلے کا دن ہے۔

نجمہ کے ڈیڈی نے آہستہ سے کہا۔

"یہ میرے لئے بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ میری بیٹی ایک نامحرم کے پاس بیٹھی ہے۔ جبکہ وہ گھر سے یونیورسٹی پڑھنے آئی تھی۔"

نجمہ کا مُنہ شرم سے لال اور پھر خوف سے زرد ہو گیا۔ اس نے ندامت سے سر جھکا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ ڈیڈی نے کہا۔

"میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے اس المیے پر اپنی بیٹی کی آزاد روش کا ماتم کرنا چاہیئے یا اس نوجوان کا جس نے اسے اس راستے پر ڈالا۔"

انور نے زمین کی طرف نظریں گاڑے ہوئے کہا۔

"میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ جسے آپ المیہ سمجھ رہے ہیں یہ المیہ نہیں ہے۔ نجمہ اور میں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ہم نے زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے کو پسند کر لیا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ اتنے بڑے شہر میں ہر ایک گھنٹے کے بعد ایک لڑکا دوسری لڑکی کو پسند کرتا ہے اور پھر اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ زندگی انارکلی کا بازار نہیں جہاں سے آپ اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ بڑے آرام سے گزر سکتے ہیں لڑکی کو پسند کرنا اور پھر اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔"

انور نے سگریٹ جلا لیا۔

"لیکن محترمی! میں ان لوگوں سے مختلف ہوں۔ میں نے کبھی زندگی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ اس کے لئے کسی جیون ساتھی کو بھی پسند کرتا پھروں۔ لیکن جب سے نجمہ سے ملاقات ہوئی ہے میری زندگی کی ویران راہوں پر بہار کے پھول مسکرانے لگے ہیں۔"

"برخوردار! تم شاعری کر رہے ہو اور

میں حقیقت کی بات کر رہا ہوں۔ پسند کئے ہوئے جیون ساتھی تھوڑی دور چلنے کے بعد زندگی کا بوجھ بن جایا کرتے ہیں۔"

انور کے اندر کا آرٹسٹ بیدار ہونے لگا۔ جس نے موقع پر پکڑے گئے عاشق کو دبانا شروع کر دیا۔ اس نے سگریٹ راکھ دان میں یونہی جھاڑتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ زندگی اور زندگی کی حقیقتوں کو بالکل غلط سمجھتے ہیں۔ ایک شخص کے دانت میں درد ہوتا ہے تو وہ دانت کے درد کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ دوسرے کا کان درد کرنے لگتا ہے تو وہ کہتا ہے اصل میں کان کا درد زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے آپ لوگوں نے اپنے اپنے قیاس اور تجربات کے مطابق زندگی کو حقائق کے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اس وقت اس بند کمرے کے باہر جو ہوا چل رہی ہے وہ بھی زندگی کی اتنی ہی بڑی حقیقت ہے جتنی آپ کا سگار ہے۔ یا جتنی نجمہ ہے۔ میں نے اپنے جیون ساتھی کا انتخاب شاعرانہ جذبات سے نہیں کیا، بلکہ ٹھیک اسی طرح کیا ہے جس طرح ایک ذمہ دار گھریلو آدمی اپنے دوسری منزل کے نلکے کے لئے پائپ خریدتا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ نجمہ میری بہترین بیوی بن سکتی ہے۔ ہم دونوں ایک انتہائی خوشگوار زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مجھے زندگی کے سفر کے لئے ایک عورت کی اور نجمہ کو ایک مرد کی ضرورت ہے۔ اب جبکہ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا ہے تو پھر کیوں نہ ہم ملکر اس راستے پر سفر کریں۔"

نجمہ بت بنی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ نجمہ کے ڈیڈی بڑے غور سے انور کی باتیں سن رہے تھے۔ انور ان دونوں کے وجود اور ان کی اہمیت سے بے نیاز اپنی دھن اور لگن میں بولے جا رہا تھا۔ نجمہ کے ڈیڈی نے بجھا ہوا سگار سلگا کر پوچھا۔

"اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم نجمہ کو زندگی بھر ساتھ رکھو گے؟"

انور نے کہا۔

"اس کا کیا ثبوت ہے کہ میرے سوا کوئی اور شخص جس سے نجمہ کی شادی ہو گی نجمہ کو زندگی بھر ساتھ رکھ سکے گا؟۔ آپ دعویٰ سے کسی شخص کے بارے میں بھی یہ فیصلہ نہیں دے سکتے کہ وہ آپ کی بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھے گا اور زندگی کے آخری لمحوں تک ساتھ نبھائے گا۔ زندگی میں کھیلے جانے والے دوسرے جوؤں کی طرح یہ بھی ایک جوا ہے یہاں

فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ پتے آپ
کی حمایت میں ہوں گے۔"

نجمہ کو اندر ہی اندر فکر لاحق ہو رہا تھا کہ انور جس طرح کی باتیں کر رہا ہے وہ اُن کے ڈیڈی کو بالکل متاثر نہ کر سکیں گی اور اس طرح بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ لیکن وہ خود ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی تھی۔ اس کی زبان پر تو تالہ پڑ گیا تھا۔ اس کے ڈیڈی نے اچانک نجمہ سے سوال کیا۔

"نجمہ! ایک بات کا جواب تمہیں بھی دینا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ تم نے ایک فیصلہ کر لیا ہے اور اس سلسلے میں تم نے مجھ سے مشورہ تک لینا بھی گوارا نہیں کیا حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارا باپ ہی نہیں بہترین مشیر بھی ہوں۔ یہ کہو ـــــ کیا تم انور کے ساتھ خوش رہ سکو گی؟"

نجمہ کی زبان ایک من بوجھل ہو رہی تھی۔ اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ پہلے تو وہ بالکل گم سُم بیٹھی رہی۔ جب اُس کے ڈیڈی نے اصرار کیا تو اُس نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

انور کو ڈر تھا کہیں نجمہ کی بے موقع خاموشی سارا کام خراب نہ کر دے کیونکہ وہ بالکل نہیں بول رہی تھی۔ مگر وہ نجمہ کو بولنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ جب اس کے ڈیڈی نے دوسری بار نجمہ کی زبان سے اقرار سننے کو کہا۔ تو آہستہ سے بولی۔

"جی ہاں۔"

"ایک بار پھر سوچ لو۔ ہو سکتا ہے تمہیں
جلدی میں کیے گئے فیصلے پر بعد میں پچھتانا پڑے۔ مگر پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔"

اس کے ساتھ ہی خدا جانے نجمہ کو کہاں سے زبان مل گئی۔ اُس نے دوسری طرف منہ کر کے کہا۔

"میں کبھی نہیں پچھتاؤں گی۔ میں نے خدا اور اُس کے رسول کو حاضر ناظر جان کر انہیں اپنی زندگی کا ساتھی اور مالک تسلیم کر لیا ہے ڈیڈی!"

نجمہ کے ڈیڈی نے سگار راکھ دان میں مسل دیا۔

"خدا کرے تمہارا انتخاب اور فیصلہ درست ہو اور تمہاری وجہ سے مجھے بڑھاپے میں پریشان نہ ہونا پڑے۔ اگر تم دونوں کا یہی آخری فیصلہ ہے تو پھر میں بیچ میں آنے والا کون ہوں۔ انور! میں تم سے یہ سوال نہیں کروں گا کہ تمہارا خاندانی شجرہ کیا ہے اور تم کیا کرتے ہو اور کیا کرو گے۔ دسمبر میں تاریخ مقرر ہو جانے پر تم بارات لے کر آ جانا۔"

اس کے ساتھ ہی نجمہ کے ڈیڈی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے انور سے ہاتھ ملایا۔ نجمہ کو بڑی محبت سے اُٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نجمہ اُن کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ پڑی۔

نجمہ کے ڈیڈی نے جو کہا تھا اس پر برابر قائم رہے اور دسمبر کے پہلے ہی ہفتے میں انور اور نجمہ کی شادی ہو گئی۔ انور کی بارات میں لاہور کے سبھی

آرٹسٹوں اور فن کاروں نے شرکت کی۔ بارات دُلہن کو لے کر سمن آباد والے کوارٹر میں آ گئی۔ یہاں انور نے اپنے دوستوں کو ایک دعوت دی۔ یہ دعوت اپنی نوعیت کی بڑی دلچسپ دعوت تھی۔ اس میں دلہا دُلہن کے علاوہ انور کے بے تکلف دوست شریک تھے۔ کوئی بھی نامحرم اور بزرگ آدمی موجود نہیں تھا۔ سبھی آرٹسٹ، شاعر، نقاد۔ ادیب اور موسیقار تھے۔ ہمایوں نے سب دوستوں کے لئے بیئر اور وائن کا انتظام کر رکھا تھا۔ اکبر نے کھڑے ہو کر اقبال کی ایک پوری نظم ترنم سے پڑھ کر سنائی دُبلے پتلے نازک اندام دہریے سعید نے شادی کے خلاف ایک تقریر جھاڑ دی جسے سب لوگوں نے تالیوں۔ سیٹیوں اور شیم شیم کے نعروں کے درمیان سُنا۔ چھپٹی ہوئی ناک والے مادہ پرست یوسف نے شادی کی بُرائیوں اور شادی کی اچھائیوں پر ایک زبردست لیکچر دیا۔ سبز آنکھوں والے شاعر صبا نے ایک سہرا پڑھا۔ بیئر اور وائن کے سرور میں سبھی لوگ بہت زیادہ کھا گئے۔ اُن کے چہرے پسینے سے بھر گئے اور آنکھیں سُرخ ہو کر دہکنے لگیں۔ جب نشہ زیادہ ہو گیا تو وہ ایک دوسرے کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ یوسف نے صبا سے کہا۔

"تم بکواسی شاعر ہو، تم فراق گورکھپوری
کی نقل اُڑاتے ہو"

صبا نے چلا کر کہا۔

اور تمہارے مقالے دوسرے لوگوں کا
چربہ ہوتے ہیں۔ تم ادب کی الف بے
سے بھی واقف نہیں ہو۔ تمہیں مقالہ
نویسی چھوڑ کر مگدر گھمانے چاہئیں۔ میکلوڈ روڈ
پر آلو چھولے بیچنے چاہئیں"

ہمایوں کافی بیئر پی گیا تھا۔ اس کے بالوں کی لٹ چہرے پر بکھری ہوئی تھی اور وہ کرسی پر جھومتے ہوئے بار بار میز پر مکے مارنے لگتا۔

"او کمینے اکبر! میں تیری سب کرتوتیں
جانتا ہوں۔ تو ایک مجاور ہے۔ تو
ایک مگرمچھ ہے جو اُردو شاعری کی لاش
کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹے لئے جا رہا
ہے۔ کمینے! میں ایک نہ ایک دن تیرا
قلع قمع کر دوں گا۔ ہائے جنگل! مہاگنی کے
سیاہ درختوں سے بھرا ہوا جنگل ——
یوسف! بیئر لاؤ —— عابدہ کو لاؤ۔
جنگل —— آہ جنگل ——"

اکبر جو کہ بڑا صوفی آدمی تھا مسکراتا رہا۔

"مکار لومڑ! تو ہنس رہا ہے۔ کمینے! میری
حالت پر ہنس رہا ہے۔ تو ایک ریچھ
ہے جس نے عربی لباس پہن رکھا ہے۔
تیرے سر پر اقبال بھوت بن کر سوار ہو
گیا ہے۔ تو بھی ایک بھوت ہے۔
بلکہ تو —— تو —— تو بھوتنی کا ہے"

پھر ہمایوں نے انور اور نجمہ کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے۔

"کمینو! شادی کر والی اور ہمیں پوچھا تک
نہیں۔ اچھا کیا۔ اچھا اب شادی مبارک
ہو"

پھر ہمایوں نے یونانیوں کے انداز میں ایک ہاتھ سلام کرنے کی غرض سے اوپر اٹھایا اور آنکھیں گھما کر بولا۔

"مبارک ہیں وہ لوگ جو شادی کرتے ہیں۔

بچے پیدا کرتے ہیں اور ان کی پرورش کرتے
ہیں اور خدا کو یاد کرتے ہیں اور دوستوں کو
بھی یاد رکھتے ہیں۔"

سعید نے بیئر کی خالی بوتل کے آخری چار قطرے نشے میں دھت پڑے ہوئے شاعر صبا کے سر پر انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری شادی کب ہوگی کمینے بدصورت
انسان!"

ہمایوں نے جلدی سے کہا۔

"او غافل افغان! اپنی خودی پہچان۔"

اکبر نے چہک کر کہا۔

"یہ بھی علامہ صاحب کی نظم ہے۔"

ہمایوں نے چیخ کر کہا۔

"شٹ اپ یو سٹوپڈ اولڈ ریچھ ——!
یہ میری نظم ہے۔ یہ میری نظم کا پہلا شعر
ہے جو میں نے ابھی ابھی کہا ہے۔ اپنے
—— اپنے یار کی شادی کی خوشی میں
کہا ہے۔ لکھا ہے (جیب سے پرچہ
نکال کر) لکھا ہے —— مایوس مریضوں
کو خوشخبری —— ارے —— یہ تو سالا
اشتہار نکل آیا —— اچھا میں زبانی
ہی سناتا ہوں۔ لکھا ہے۔"

شاعر صبا نے آنکھ کھول کر کہا۔

"سالے! لکھا ہے نہیں —— عرض کیا

ہے"

ہمایوں نے غرا کر کہا۔

"کمینے! عرض تو کرتا ہے، ہمایوں فرماتا
ہے یا لکھتا ہے۔ لکھا ہے۔

اپنی شادی پہچان
او غافل پٹھان
او غافل انسان"

اس کے بعد ہمایوں کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی اور محفل قہقہہ زار بن گئی۔ پھر سب نے اٹھ کر باری باری انور اور نجمہ کے گلے میں وہ پھولوں کے ہار ڈالے جو انہیں بارات میں دئے گئے تھے۔ رات کے قریباً ایک بجے سب دوست رخصت ہو گئے اور وہاں نجمہ اور انور یعنی دلہا اور دلہن اکیلے رہ گئے۔ انور نے برتن اٹھوانے کے لئے نوکر کو آواز دی تو کوئی نہ بولا۔ پھر اس نے خود جا کر دیکھا کہ وہ ایک کونے میں پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ ہمایوں نے اسے بھی بیئر کے دو گلاس پلا دیئے تھے۔

دونوں میاں بیوی کی شادی کی پہلی رات بھی بڑے غیر روایتی انداز میں گزری۔ نجمہ کو جہیز میں کافی سامان دیا گیا تھا۔ بلکہ ہمایوں نے تو ہر چیز کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا تھا۔ اور ٹھونک بجا کر دیکھا تھا۔ انور اور نجمہ نے یہ رات سٹوڈیو کے کباڑ خانے میں بسر کی۔ سردی کافی تھی۔ انور نے ہیٹر جلا لئے۔ کافی بنائی اور دونوں بید کے پرانے صوفے پر بیٹھ کر کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نجمہ نے دلہنوں والا بھاری بھرکم لباس پہن رکھا تھا۔ انور نے اس کے کپڑے تبدیل کروا دیئے نجمہ صرف چہرے سے اب دلہن معلوم ہوتی تھی۔ کافی رات گئے دونوں باتیں کرتے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر بچوں کی طرح چمٹے ہوئے دیوان پر سو گئے۔ تیسری رات انور نے نجمہ کی نیوڈ تصویر بنائی۔ آخر وہ اپنے مقصد میں

کامیاب ہوگیا۔ نجمہ بڑی منت سماجت کے بعد بالکل عریاں حالت میں دیوان پر لیٹنے پر رضامند ہوئی۔ پھر بھی اس نے روشنی کم کروادی۔ انور نے ٹیبل لیمپ جلا لیا۔ نجمہ کو کلاسیکی پوز میں دیوان پر لٹایا اور خود سکیچ بک زانوؤں پر کھول کر بجلی ایسی تیزی اور مشاقی کے ساتھ پنسل سے سکیچ کرنا شروع کردیا۔ نجمہ نے ایک بازو اپنی آنکھوں پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا اس کے پیٹ پر تھا۔ انور اس تصور کے لئے زندگی کی بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ وہ بڑی گرمجوشی اور گہرے انہماک سے تصویر سکیچ کرتا چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے پورے بیس دن لگا کر اس تصویر کو کینوس پر پینٹ کیا۔ وہ خود نجمہ کا خوبصورت جسم دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سامنے یوکلپٹس کا ایک عظیم الشان درخت کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے جس میں ابھی تک زندگی کی گرمی اور خوشبو موجود ہے۔

اُس نے اس تصویر کو سرخ سیاہ کتھئی اور لائٹ میجنٹا کلر میں پینٹ کیا تھا۔ بہرحال رنگوں کا امتزاج اس کا اپنا تھا اور وہ یہی رنگ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہ تصویر اُس نے کبھی کسی کو نہیں دکھائی تھی۔ خود ہر دوسرے تیسرے اُسے صندوق میں سے نکال کر اس کے درشن کر لیا کرتا۔ نجمہ کے ڈیڈی کا ایک مکان کینال بینک کے علاقے میں تھا۔ اس مکان کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ بمشکل خالی ہوا تو اُس نے نجمہ اور انور کو وہاں بھجوادیا۔ یہ مکان تین کشادہ کمروں اور ایک صحن پر مشتمل تھا جس کی دیوار پر گلاب کی سفید پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ انور اس مکان میں آکر باقاعدہ رہنے لگا۔ آرٹس کالج میں تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ سارا وقت کمرشل کام پر صرف کرتا۔ دوسری طرف نجمہ نے بھی نفسیات کا ایم اے کر لیا تھا اور ایک مقامی گرلز کالج میں لیکچرار ہوگئی تھی۔ ان کے دن بڑے مزے سے گزرنے لگے۔ لیکن ایک خلش نجمہ کے دل میں کھٹکنے لگی تھی شادی کو تیسرا سال جا رہا تھا اور اس کے ہاں ابھی تک کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

اس نے بہتیرے علاج کروائے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ انور کو اولاد سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر بھی نجمہ کی خاطر اور نجمہ کو اداس دیکھ کر وہ بھی چاہتا تھا کہ ایک آدھ بچہ ضرور ہوجانا چاہیئے۔

انور نے ہر قسم کے ڈاکٹروں سے مشورے کئے مگر نتیجہ امید افزا برآمد نہ ہوا نجمہ بہت اداس اداس رہنے لگی۔ شروع شروع میں یہ اداسی بڑی نارمل سی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ آنکھوں کے گرد حلقے سے نمودار ہونے لگے۔ بعد ازاں اُسے ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا۔ یہ نجمہ کی شادی کا چوتھا سال جا رہا تھا انور کو بڑی فکر ہوئی۔ نجمہ کا باپ بھی پریشان ہوگیا۔ انہوں نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ نجمہ کا ایکسرے فوٹو لیا جائے۔ ایکسرے نے ایک حیرت ناک اور افسوس ناک بات کا انکشاف کیا۔ یعنی یہ کہ نجمہ کے داہنے پھیپھڑے پر ایک ہلکا سا نشان۔ اتنی خوبصورت اور صحت مند لڑکی کو تپ دق ایسا مرض بھی لاحق ہو سکتا ہے۔ انور کو کبھی یقین نہیں آسکتا تھا۔ لیکن ایکسرے کی حقیقت کو کوئی بھی نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ نجمہ شروع میں تو بڑی پریشان ہوئی۔ مگر پھر اُس نے بیماری کو قبول کر کے اس کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈاکٹروں نے کہا کہ نجمہ کو اگر کسی پہاڑ پر بھیج دیا جائے تو اس کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑے گا۔ نجمہ کے ڈیڈی نے کوہالہ کے قرب وجوار میں ایک ڈاک بنگلے کا بندوبست کر کے اس کا ایک حصہ انور اور نجمہ کو دلوادیا۔ اور وہ دونوں کوہالہ چلے گئے۔

کوہ مری پہنچ کر نجمہ کی صحت بتدریج اچھی ہونی شروع ہوگئی۔ اس کے چہرے پر سرخی بھی پھر سے جھلکنے لگی۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی غائب ہونا شروع ہوگئے۔ لیکن ایک ماہ بعد ایک اور مرض نے نجمہ کو گھیر لیا۔ اب اُسے آدھے سر کی درد رہنے لگی جس وقت سر درد کا دورہ پڑتا، نجمہ کو ہوش نہ رہتی۔ وہ درد سے نڈھال ہوجاتی اور پلنگ پر پہلو بدلنے لگتی۔ انور نے ڈاکٹروں سے

مشورے کے بعد نجمہ کے ڈیڈی کو لکھا جنہوں نے لاہور سے ہر قسم کی دوائیوں کا انبار روانہ کر دیا اور دو دنوں کے لئے خود بھی مری آکر اپنی بیٹی کی خیریت دریافت کر گئے۔

اب ہم پھر اس مقام پر آتے ہیں جہاں سے ہم نے انور کی پچھلی زندگی کی جھلک دکھانے کے لئے کہانی کا سلسلہ ایک وقت کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ پہلی رات جب انور ڈاک بنگلے سے نکل کر خانہ بدوشوں کے گیت کی آواز پر نیچے وادی میں دریا پار اُن کے ڈیرے پر گیا تھا تو نجمہ کو سر درد کا شدید دورہ پڑا تھا۔ دوسرے روز اس نے سارا دن اور پھر شام تک خانہ بدوش رقاصہ کا سکیچ تیار کیا۔ نجمہ کو دن بھر تو آرام رہا۔ رات کو پھر آدھے سر کی درد نے آلیا۔ انور نے پورے انہماک اور ہمدردی سے نجمہ کی تیمارداری کی اور رات کو پھر خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

چاند کل والی رات کی طرح آج بھی چیڑ کے درختوں کے اوپر مسکرا رہا تھا اور پورا کھلا ہوا تھا۔ دریائے جہلم کا پاٹ اگرچہ چھوٹا تھا مگر لہروں کی رفتار بڑی تیز تھی اور چاندنی رات میں سفید شفاف پانی جھاگ اُڑا رہا تھا۔ وادی میں سرد ہوا چل رہی تھی اور رات بڑی ٹھنڈی تھی۔ کل کی طرح آج بھی خانہ بدوشوں نے ایک بڑا سا الاؤ روشن کر رکھا تھا اور اکتارے پر گیت گایا جا رہا تھا۔ گلنار اسی طرح رقص کر رہی تھی۔ آج اس کا لباس بدلا ہوا تھا۔ اس نے چولی کے ساتھ سرخ رنگ کی گھگری پہن رکھی تھی جس پر جا بجا چھوٹے چھوٹے ان گنت گول گول شیشے ٹکے ہوئے تھے۔ اس کے لمبے سیاہ بال کھلے تھے اور شانوں پر گرے ہوئے تھے۔ چہرہ الاؤ کی روشنی میں تمتما رہا تھا اور کلائیوں میں گلاب کے جنگلی پھول بندھے ہوئے تھے۔ وہ رقص کرتے کرتے ایک دم رک گئی اور پاؤں بھر کاتے ہوئے گھنگھروؤں کی تھاپ پر الاؤ میں کسی شے کو غور سے دیکھتی رہی۔ اکتارے

والا سر جھکائے اکتارہ گود میں لئے دُھن بجاتا رہا۔ گلنار نے یکایک بازو ہوا میں لہرائے اور بجلی ایسی تیزی کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ اُس کے کھلے بال اس کے ساتھ ساتھ گردش کھانے لگے۔ اکتارے کی دھن تیز ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی گلنار کا رقص تیز تر ہو گیا۔ نصف دائرے کی شکل میں خانہ بدوش بیٹھے رقص سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دوسری طرف کچھ عورتیں یہاں وہاں سے میلے کچیلے لحاف اٹھائے خیموں میں جا رہی تھیں۔ سامنے چیڑ کے درخت تلے چند ایک گدھے بندھے تھے۔ درختوں کے درمیان سے پہاڑی چاند گول گول چاندی ایسا چمکیلا چہرہ نکالے خانہ بدوش دوشیزہ کا رقص دیکھ رہا تھا۔

انور کسی خاص کشش کے زیر اثر ٹیلے کا چکر کاٹ کر ڈھلوان اتر گیا۔ اور الاؤ کے پاس خانہ بدوشوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ سردار نے آج بھی انور کو بڑے غور سے دیکھا اور اپنے ساتھی کے کان میں جھک کر کوئی بات کی۔ گلنار نے بھی ناچتے ناچتے ایک پل کے لئے انور کو دیکھا اور ذرا سا مسکرا دی اور پھر بڑے جوش سے ناچنے لگی۔ سردار نے گلنار کے رقص میں نمایاں تبدیلی کو محسوس کیا اور منہ میں رکھی ہوئی کوئی چیز چبا چبا کر آگ میں تھوکتا رہا۔

رقص ختم ہوا تو گلنار سردار کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور کلائیوں میں پھولوں کے گجرے اتارنے لگی۔ سردار نے اس کی کلائی تھام لی۔

"ابھی انہیں رہنے دو۔"

"مگر میں تھک گئی ہوں سردار!"

"گلنار چاندنی راتوں میں ہمیشہ ناچتی رہے گی۔"

اس کے بعد گلنار نے اٹھ کر بادل نخواستہ پھر رقص کرنا شروع کر دیا۔ اب اس کے رقص میں وہ زندگی اور زندگی کا وحشی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ کچھ دیر چکر لگاتے رہنے کے بعد وہ پھر بیٹھ گئی۔ سردار قہقہہ مار کر ہنسا اور اس نے اپنے ہنٹر سے

فضا میں شڑاپ کی آواز پیدا کی اور اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی دوسرے خانہ بدوش بھی وہاں سے ہلنا شروع ہو گئے۔

گلنار الاؤ کے پاس بیٹھی تھی اور اپنے پاؤں پر ہاتھ سے مالش کر رہی تھی انور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ گلنار نے ایک اچٹتی سی نظر سے انور کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول رہی۔ انور نے دیکھا کہ گلنار کا چہرہ الاؤ کی روشنی میں پسینے کے ننھے ننھے قطرے لئے چمک رہا تھا۔ آنکھوں ـــــ گہری سیاہ آنکھوں میں وحشی ہرنیوں ایسا جادو اور بے قراری تھی۔ بھویں بڑی شوخی اور تیکھے پن سے تنی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ایک جنگلی جلال اور وحشی تاثر تھا۔ جیسے سورج طلوع ہوتے ہوتے اچانک رُک گیا ہو۔ اس نے انور کی طرف دھیان دئے بغیر کلائیوں پر سے پھولوں کو کھول کر پھینک دیا۔ انور نے جھٹ ان پھولوں کو اُٹھا لیا۔

گلنار نے تڑپ کر انور کو دیکھا اور بولی۔

"کون ہو تم؟"

"خانہ بدوش"

انور نے گلاب کے پھولوں کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ گلنار نے انور پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالی اور کہنے لگی۔

"شہر کے خانہ بدوش معلوم ہوتے ہو۔"

"لیکن جنگل والوں سے ناطہ جوڑنا چاہتا ہوں۔"

"جنگل والے خانہ بدوش........"

گلنار اچانک بات کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس نے ایک طرف دیکھا اور انور کو آہستہ سے اتنا کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

"پھر کبھی ادھر نہ آنا۔"

انور اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ اچانک کسی نے اس کے کندھے کو

ہنٹر کے دستے سے چھوا۔ انور نے چونک کر دیکھا۔ سامنے خانہ بدوشوں کا سردار کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟"

ایک زوردار آواز گونجی۔ انور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"انسان۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ یہاں کیا لینے آتے ہو؟"

"ناچ دیکھنے۔"

سردار نے نفرت سے ایک طرف تھوک کر کہا۔

"کیا یہاں رنڈیوں کا مجرا ہوتا ہے؟"

انور نے کہا۔

"جو بھی ہوتا ہے میں صرف اسی کو دیکھنے یہاں آتا ہوں۔"

"تو پھر کل سے ادھر کا رُخ نہ کرنا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ سردار شمور تمہیں پسند نہیں کرتا۔"

"مجھے کسی کی پسند ناپسند کی کیا پرواہ ہے میں یہاں ضرور آؤں گا۔"

سردار نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور ہنٹر کے دستے سے انور کو دھکیلتے ہوئے بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے۔ تم خودکشی کے

ارادے سے گھر سے نکلے ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"خاموش۔"

سردار نے گرج کر کہا اور ساتھ ہی فضا میں ہنٹر کا پٹاخہ چھوڑا۔ جس کی آواز گولی کے دھماکے کی مانند سارے جنگل میں پھیل گئی۔ انور نے ایک پل کے لئے سوچا کہ زمین پر سے پتھر اُٹھا کر سردار کے سر پر دے مارے۔ آخر اس ترقی یافتہ اور مہذب دنیا میں یہ شخص اپنی ڈکٹیٹری جتانے والا کون ہے۔ پھر جب اس کی نگاہ ایک طرف گئی تو اُسے خیمے کے پیچھے کھڑی گلنار دکھائی دی۔ وہ بڑی فکر مند نگاہوں سے انور اور سردار کو تک رہی تھی۔ سردار نے کڑک کر کہا۔

"اگر میں نے کل تمہیں یہاں دیکھا تو تمہاری تکا بوٹی کر دوں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔

انور نے پلٹ کر گلنار والے خیمے کی طرف دیکھا۔ گلنار وہاں موجود نہ تھی۔ سارے خانہ بدوش اپنے اپنے پھٹے ہوئے خیموں یا چھولداریوں میں گھس گئے اور وہاں سناٹا چھا گیا۔ انور وہاں اکیلا رہ گیا۔ وہاں سوائے چیڑ کے اونچے لمبے خاموش درختوں، ان درختوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے متفکر چاند اور ذرا فاصلے پر سے دریائے جہلم کے پانیوں کی ہلکی ہلکی آواز کے سوا اور کچھ نہ تھا

انور وہاں سے واپس ہو لیا۔ راستے میں وہ سوچنے لگا کہ وہاں آئے یا گھر پر ہی بیٹھا رہے۔ عشق کا یہ تقاضا تھا کہ کل ضرور آئے۔ عقل یہ کہتی تھی کہ اُسے گھر پر بیٹھ کر اپنی بیوی کی تیمارداری کرنی چاہیئے۔

جن معنوں میں دنیا کے بے وقوف عقل کو استعمال کرتے ہیں، انور نے زندگی میں اس طرح عقل سے کبھی کام نہ لیا تھا۔ اُس کے خیال میں عقل سے صرف وہ لوگ کام لیتے ہیں جو پیدائشی احمق ہوتے ہیں۔ عقل مند آدمی عقل سے کبھی کام نہیں لیتا۔ اس کا ہر فعل خود بخود عقل کے معیار پر پورا اُترتا چلا آتا ہے۔ چنانچہ اُس نے دل میں فیصلہ کرنا مناسب ہی نہ سمجھا کہ وہ کل بھی آئے گا کیونکہ اُسے تو ہر حالت میں کل پھر وہاں آنا تھا۔ وہ تو کسی قیمت پر بھی وہاں آنے سے رُک ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی طبیعت اور مزاج کا یہی تقاضا تھا اور انور اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کا آدمی تھا۔ لوگوں کی عقل کا نہیں۔

جب وہ ڈاک بنگلے پر پہنچا تو نجمہ بڑی پریشانی کے عالم میں جاگ رہی تھی۔ وہ انور کو دیکھتے ہی اُس سے لپٹ گئی۔

"خدا کے لئے آپ وہاں نہ جایا کریں۔
میں نے بڑا ڈراونا خواب دیکھا ہے۔"

انور نے مسکرا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"تم فکر نہ کیا کرو نجمہ! تمہارے انور کو کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر میں تو وہاں صرف خانہ بدوش کی زندگی سٹڈی کرنے جاتا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کے معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں نہیں، آپ وہاں نہ جایا کریں۔
مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

نجمہ انور سے لپٹ گئی۔ انور نے بڑی محبت سے نجمہ کے شانے تھپتھپائے اور اُس کے کانوں پر بڑے پیار سے بوسہ دے کر بولا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

نجمہ اُداس لہجے میں کہنے لگی۔

"پہلے اچھی تھی لیکن جب آپ کو پلنگ پر نہ دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ آپ وعدہ

کریں کل سے گھر پر ہی رہیں گے۔ اس
طرح آپ اپنی صحت خراب کرلیں گے
آپ رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں
آپ کی زندگی سے ہی میری زندگی ہے"

انور ہنس پڑا۔ وہ کپڑے اُتار کر شب خوابی کا لباس پہن رہا تھا۔

"تم تو یونہی وہم کر رہی ہو۔ آخر مجھے تصویر
بھی تو مکمل کرنی ہے۔"

"مجھے آپ کی زندگی ان تصویروں سے
زیادہ عزیز ہے۔ خدا کے لئے آپ ان
تصویروں کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ آپ کی
زندگی پر آ بنے۔"

"اچھا بابا! کل سے گھر پر ہی رہوں گا۔"

لیکن دوسری رات انور پھر خانہ بدوشوں کے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ رات کافی گزر چکی تھی بلکہ رات کا پچھلا پہر شروع ہونے کو تھا۔ جنگل پر بڑی غیر مانوس گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انور کو اس ہیبت ناک خاموشی سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ اُسے زمانہ قدیم کے وہ عاشق یاد آگئے جو تلوار بردار پہرہ داروں کی موجودگی میں اپنی محبوباؤں کو ملنے جایا کرتے تھے۔

ایک پرندہ چیختا ہوا چیڑ کے درخت سے اُڑا اور چاندنی رات اب اوس گرنے لگی تھی اور انور کے قدموں تلے گھاس گیلی ہو رہی تھی۔ کہیں قریب ہی اُسے کسی پہاڑی چشمے کی رل ترل سنائی دی۔ فضا میں چیڑ کے درختوں کی سوندھی مہک بسی ہوئی تھی۔ جب وہ دریائے جہلم کا چھوٹا سا لکڑی کا پل عبور کرنے لگا تو اُس نے دیکھا کہ پانی انتہائی شفاف تھا اور جھاگ اُڑاتا بہا چلا جا رہا تھا۔ مشرقی جانب صبح کاذب سے پہلے کی ہلکی ہلکی نیلاہٹ چھا رہی تھی اور ستاروں

کا رنگ زرد ہوا جا رہا تھا۔ دُور کوہالہ شہر گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ ایک بار اُس طرف سے کسی مرغ کی اذان سنائی دے گئی۔

انور سمجھ گیا کہ رات ختم ہونے کو ہے اور وہ دیر سے اُٹھا ہے۔ اس وقت گلنار کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی عشق کی لگن اُسے کشاں کشاں خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ ٹیلے کا چکر کاٹ کر جب وہ نیچے ڈھلوان اُترنے لگا تو اس نے دیکھا کہ خانہ بدوش اپنے اپنے پھٹے ہوئے خیموں میں سو رہے تھے۔ وہاں کوئی الاؤ روشن نہ تھا۔ کوئی گلنار بال بکھرائے کلائیوں میں گلاب کے پھولوں کے گجرے پہنے محو رقص نہ تھی۔ خیموں پر چیڑ کے درختوں کے سائے تھے اور کہیں کہیں چاندنی کے سفید دھبے نظر آ رہے تھے۔ انور سوچنے لگا۔ گلنار کسی خیمے میں سو رہی ہوگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس خیمے کے باہر کھڑا ہو کر آہستہ سے اُسے آواز دے۔ گلنار دبے پاؤں چولی سنبھالتی باہر نکل آئے اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر کہے۔

"شی۔ اِدھر آجاؤ۔"

اور وہ پاس والے جنگل میں گھس جائیں اور کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر ایک دوسرے سے جی بھر کر باتیں کریں۔ مگر ایسا ہونا غیر ممکن تھا۔ ایک تو اُسے گلنار کے خیمے کی خبر نہ تھی۔ دوسرے اُسے اس بات کا بھی یقین نہ تھا کہ گلنار اس کے ساتھ جنگل میں چلی جائے گی اور شور نہیں مچا دے گی۔

تھوڑی دیر اُس ویران فضا کو خالی خالی نگاہوں سے گھورتے رہنے کے بعد انور وہاں سے واپس آ گیا۔ اُس نے واپس ڈاک بنگلے میں جانے کی بجائے وہیں پہاڑی جنگلوں میں گھومتے رہنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ کیونکہ ابھی کوئی دم میں صبح ہونے والی تھی۔ کوہالہ کی طرف سے اب مرغوں کی اذانیں دینے کی مسلسل صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ صبح کی تازہ دم ہوا میں چیڑ کے درختوں کی اوس میں بھیگی ہوئی شاخیں سرسرا رہی تھیں۔ انور کافی دیر تک دریا کے ساتھ ساتھ جنگل میں گھومتا پھرتا رہا۔

یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ وادی میں رات کے سائے صبح کی اوّلین روشنی میں گم ہو گئے۔ درختوں پر پرندوں نے چہکنا شروع کر دیا۔ طوطوں کی ٹولیاں پھلدار باغوں کی طرف پرواز کرنے لگیں۔ دریا کا پانی صاف دکھائی دینے لگا اور آسمان کے پس منظر میں ہمالیہ کی چوٹیوں کے خاکے اُبھر آئے۔ اب سورج دیوتا کا سنہری رتھ نمودار ہوا اور سارے جنگل میں اس کی سونے ایسی زرّیں کرنوں کا جال پھیل گیا۔ پیڑ پودوں پر اوس کی بوندیں چمک اٹھیں اور جھاڑیوں میں بُنے ہوئے مکڑی کے جالوں پر موتیوں کی اُلجھی ہوئی لڑیوں کا گمان ہونے لگا۔

انور کوہالہ کے بڑے پل تک گیا اور پھر وہاں سے واپس چل پڑا۔ جب وہ پھر اسی جنگل میں آیا تو سورج پہاڑ کی چوٹیوں کے اوپر آ گیا تھا اور درختوں کے درمیان اس کی سنہری کرنیں گھاس کے شبنمی قطعوں کو نمایاں کر رہی تھیں۔ یہاں اُسے ایک چشمہ دکھائی دیا۔ چشمہ کیا تھا۔ پہاڑ پر سے پانی کی ایک لکیر سی آ رہی تھی۔ ایک جگہ پتھروں کے درمیان آ کر پانی جمع ہو گیا تھا اور یہاں سے پھر ایک نالی کی شکل میں دریا کی طرف بہنے لگا تھا۔ گاؤں والوں نے اس جگہ پتھر جوڑ کر ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا دیا تھا۔ یہاں دن کو عورتیں کپڑے دھوتیں، مویشی پانی پیتے اور نہاتے تھے۔

انور نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی انتہائی سرد تھا۔ اس کے ہاتھ پہلے ٹھنڈے اور پھر گرم ہو گئے۔ انور کو یوں لگا گویا اُس نے ہمالیہ کے برفانی انسان سے مصافحہ کر لیا ہو۔ اُس نے چبوترے پر بیٹھ کر خوب اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا۔ رومال سے منہ پونچھا اور لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چشمے کے آس پاس اُگے ہوئے تناور چیڑ کے درختوں میں گھوم پھر کر صبح کی تازہ دم ہوا میں گہرے سانس لینے لگا۔ اُسے ہر سانس پر یوں محسوس ہوتا جیسے وہ زندگی میں پہلی بار سانس لے رہا ہے۔ ستمبر کے دن تھے اور درختوں پر سے چیڑ کے نوکیلے جھومر خشک ہو کر گرنا شروع ہو گئے تھے۔

اُسے یونہی ایک خیال آیا اور وہ جیب سے چاقو نکال کر ایک درخت کے کھردرے تنے پر گلنار کا نام کھودنے لگا۔ ابھی اُس نے آدھا نام ہی کھودا تھا کہ اُسے کچھ آہٹ سنائی دی۔ اُس نے گھوم کر دیکھا تو وہ حیران سا ہو کر رہ گیا۔ چشمہ اس سے ذرا فاصلے پر تھا۔ انور نے دیکھا کہ ایک لڑکی گھڑا اٹھائے چشمے پر آ کر پانی بھرنے لگی ہے۔ انور نے اُسے فوراً پہچان لیا۔ یہ گلنار تھی۔ گلنار اپنے خیال میں مگن تھی۔ ویسے بھی انور درختوں کی اوٹ میں تھا۔ گلنار نے پانی سے بھرا ہوا گھڑا ایک طرف رکھا، چبوترے پر بیٹھ گئی اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ منہ دھو کر اس نے گھگری کا پلّو اٹھا کر منہ پونچھا اور گھڑا اٹھا کر واپس روانہ ہو گئی۔

انور نے چاقو بند کر کے جیب میں رکھا اور پہاڑی کے اُوپر سے ہو کر جنگل میں ایک ایسی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے گلنار ابھی گزرنے والی تھی۔ انور نے اپنے آپ کو درخت کی آڑ میں چھپا لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گلنار سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس نے گھڑا اٹھا رکھا تھا۔ جس طرح دیہاتی عورتیں اپنا بچہ اُٹھاتی ہیں۔ پتلی سی جنگلی پگڈنڈی پر درختوں میں سے نکل نکل کر دھوپ پڑ رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی طاری تھی۔ جب گلنار انور کے قریب سے گزرنے لگی تو انور درختوں میں سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"اوئی"

گلنار نے چونک کر انور کو دیکھا اور ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"تم!"

انور نے کہا۔

"ہاں میں"

گلنار کے رخسار ٹھنڈے پانی کے چھینٹے کھانے کے بعد سُرخ ہو رہے تھے۔ یہ سُرخی سانولی تھی اور اس سیب کی یاد تازہ کر رہی تھی جو بہت زیادہ پک گیا ہو۔ اس کے بال یونہی گردن پر باندھے ہوئے تھے۔ دو ایک لٹیں پیشانی پر پھیلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں رات بھر بے فکری سے سونے کے بعد کی تازگی اور شگفتگی تھی۔ چولی پیٹ

پر پھنسی ہوئی تھی اور بھرے بھرے گداز بازو کہنیوں کے اُوپر تک ننگے تھے۔
انور نے ذرا آگے جھک کر پوچھا۔

"کیا چلا جاؤں؟"

گلنار نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ــــ چلے جاؤ۔"

"لیکن میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

گلنار ہنس پڑی۔ اس کے سفید موتیوں ایسے دانت صبح کی روشنی میں چمک اُٹھے۔

"وہ کیوں؟"

انور نے کہا۔

"اس لئے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

گلنار نے انور کا ہاتھ پکڑا اور اُسے پگ ڈنڈی سے ہٹ کر پاس والے درختوں کے جھنڈوں میں لے گئی۔ یہاں پہنچ کر اُس نے ایک جگہ اپنا گھڑا گھاس پر رکھ دیا۔ اور کہنے لگی۔

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

انور گلنار کی اس حرکت پر حیران سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ابھی تک اُسے اپنے ہاتھ میں گلنار کے ہاتھ کی نرمی اور کھُردرا پن محسوس ہو رہا تھا۔

"ہاں گلنار! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے جب پہلی رات کو تمہیں ناچتے دیکھا تھا تو تم پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا مجھے اس دن سے کیا ہو گیا ہے۔ راتوں کو بے اختیار اُٹھتا ہوں اور تمہاری طرف چل پڑتا ہوں میں آج رات بھی تمہارے خیموں کی طرف آیا تھا مگر تم لوگ سو رہے تھے۔ میں کل بھی آؤں گا اور پرسوں بھی۔ جب تک تم یہاں موجود ہو میں ہر روز تمہیں دیکھنے آتا رہوں گا۔"

"اور جب میں یہاں سے چلی گئی؟"

گلنار نے انور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ انور نے دیوانوں کی طرح گلنار کے رخساروں، شہد بھرے تر و تازہ اُبھرے اُبھرے ہونٹوں، خوبصورت وحشی اور کھنچی ہوئی آنکھوں اور پُرعزم ستواں ناک کو تکتے ہوئے کہا۔

"پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا۔"

"نہیں بابو! تم میرے ساتھ نہیں جا سکتے ہم لوگ خانہ بدوش ہیں۔ ہم محبت پر یقین نہیں رکھتے۔ ہم ہر جنگل سے پیار کرتے ہیں اور ہر جنگل سے ہنسی خوشی رخصت ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن میں تم سے ہنسی خوشی جُدا نہیں ہوں گا۔ میں تمہیں کبھی اپنے سے الگ نہیں ہونے دوں گا۔ گلنار میں تمہاری محبت کے پیچھے میں ہوں۔ مجھ پر تمہاری شخصیت نے جادو کر دیا ہے۔ میں چاہوں بھی تو تم سے جُدا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں بھلا نہیں سکتا۔"

گلنار پر جیسے انور کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑے آرام سے گھاس پر بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ بھرے ہوئے مٹکے کے منہ پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ گھاس کا تنکا توڑ کر اُسے دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ انور نے گلنار کا ہاتھ اپنے

ہاتھ میں لے لیا۔ گلنار نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا۔ اور انور کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"لاہور سے۔"

"تمہاری بیوی بھی ہے؟"

انور نے ایک پل کے لئے سوچا کہ وہ گلنار سے نجمہ کا ذکر نہ کرے مگر انور محبت میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے منہ سے اپنے آپ ہی نکل گیا۔

"ہاں۔"

"تو اس کا خیال رکھا کرو۔"

اتنا کہہ کر گلنار نے مٹکا سنبھالا اور پیشتر اس کے کہ انور اُسے روک سکے وہ درختوں میں سے ہو کر پگ ڈنڈی پر پہنچ گئی۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی جنگل میں غائب ہو گئی۔

انور وہیں بیٹھا اُسے یوں تکتا رہا جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔

کچھ دیر انور وہاں ساکت سا ہو کر بیٹھا رہا۔

پھر آہستہ سے اُٹھا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ دھوپ کافی نکل آئی تھی۔ دن چڑھ گیا تھا اور درختوں پر پرندوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ انور وہاں سے واپس ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑا۔ جب وہ چشمے کے قریب سے گزرا تو اُس نے دیکھا کچھ دیہاتی عورتیں چبوترے پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں اور پاس دو بھینسیں پانی پی رہی تھیں۔ ڈاک بنگلے پر اس کا شدت سے انتظار ہو رہا تھا۔ نجمہ بے حد پریشان تھی اور اُس نے ابھی تک ناشتہ نہ کیا تھا۔ وہ برآمدے میں دھوپ میں کرسی ڈالے پڑی تھی اور سر پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ انور کو سامنے سے آتا دیکھ کر اس کی جان میں جان آ گئی۔ اُس نے آتے ہی انور سے شکوے شکایت شروع کر دئے۔ انور نے نجمہ کی طرف ایک عجیب انداز میں دیکھا۔ ان اجنبی نگاہوں کا احساس نجمہ کو بھی ہو گیا۔ وہ کانپ سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار انور کو نجمہ ایک ایسی عورت لگی جس سے اُسے کوئی سروکار نہ رہا ہو۔ اپنے اس احساس سے انور کو حیرت بھی ہوئی اور غصّہ بھی آیا۔ حیرت اس لیے ہوئی کہ یہ احساس پہلے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ غصّہ اس لیے آیا کہ اب وہ نجمہ کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ لیکن انور نے نجمہ پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔

نجمہ اُداس ہو کر کرسی پر لیٹ گئی۔

"میں جانتی ہوں کہ اب آپ کو میرا اتنا خیال نہیں رہا۔ لیکن مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں

میں آپ کی بھلائی چاہتی ہوں۔ آپ کی سلامتی
چاہتی ہوں۔ کیونکہ آپ کی سلامتی ہی میں میری
سلامتی ہے۔"

انور نے اخبار کھولتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک طرح سے تم اپنی
تیمارداری کر رہی ہو۔ اپنا خیال رکھ رہی ہو۔"

"مرد ہمیشہ اسی طرح سوچتے ہیں۔ وہ کبھی عورت
کے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کے دلی احساسات
کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

"دراصل آج کے زمانے میں مردوں کے پاس
اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ عورت کے دل پر
ہاتھ رکھ کر گھنٹوں یہ سوچتے رہیں کہ اندر کیا
ہو رہا ہے۔"

"مگر اتنا وقت ضرور ہے کہ مرد دوسری عورتوں
کی تلاش میں راتوں کو جنگلوں میں گھومتے رہیں۔"

انور ایک دم چپ ہو گیا۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ نجمہ یہ بات اُس کے منہ پر کہہ دے گی۔ اُس نے بڑی سچی بات کہی تھی۔ لیکن مرد عورت کی سچی بات کبھی تسلیم نہیں کیا کرتا۔ بلکہ وہ عورت کی سچی باتوں سے بہت زیادہ جھنجھلاتا ہے۔ وہ صرف عورت کے جھوٹ پر اعتماد کرنا چاہتا ہے اور عورت کو ہمیشہ جھوٹ بولتے دیکھنا چاہتا ہے۔ نجمہ ایک انتہائی ذمہ دار اور ایثار پیشہ عورت تھی۔ اُسے فوراً احساس ہو گیا۔ اُس نے غصّے میں ایک بڑی ہی سچی اور بڑی ہی ناگوار گزرنے والی بات کہہ دی ہے۔ وہ انور سے محبت کرتی تھی اور کسی قیمت پر بھی انور کو دُکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ انور کو اداس دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے انور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے معاف کر دیں۔ میں اب آپ کو کبھی

ایسی باتیں نہیں کہوں گی چاہے آپ جہاں بھی
جائیں۔ میں آپ سے کبھی شکایت نہیں کروں
گی۔"

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپکے سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اندر آ کر اُس نے خانہ بدوش لڑکی کی تصویر ایزل پر رکھی۔ اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ ایک بڑی حیرت انگیز تصویر تھی۔ اتنے گہرے تخلیقی اور پُراسرار جنگلی رنگ انور نے پہلے کسی تصویر میں استعمال نہ کئے تھے۔ اس تصویر کا سکائی خالی تھا۔ انور نے فوراً میز پر کچھ رنگ انڈیلے اور برش سے انہیں مکس کرنے لگا۔

دو تین رنگوں کے امتزاج کے بعد انور نے برش کی نوک کینوس کے سکائی پر رکھی اور چھوٹے چھوٹے نارنجی نما رنگ کے دائروں کی شکل میں سکائی بنانا شروع کر دیا۔ ان میں کچھ دائرے وائٹ تھے، کچھ گہرے سُرخ اور کچھ سیاہ رنگ کے۔ یہ دائرے غیر مکمل اور چھوٹے بڑے تھے اور نامکمل چاند سورجوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ انور پاگلوں کی طرح تصویر پر برش کے سٹروک لگاتا رہا۔ جب سکائی بالکل مکمل ہو گیا تو اُس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر تصویر کو دیکھا۔ یہ تصویر خانہ بدوش انسانی زندگی کا المیہ تھی۔ آدھی رات کو جنگل کے سناٹے میں گونجی ہوئی ایک کرب ناک چیخ تھی۔ عجیب الخلقت درختوں کے نیلے پتے، گندمی رنگ کی عورت کا بھرا بھرا نکھرا دراپھٹا ہوا عریاں بدن، سینے کا گہرا سیاہ داغ اور دودھ بھری، زہر بھری چھاتیوں کے بیچ میں گلاب کے دو سُرخ پھول ——— عورت کا ایک ہاتھ چھاتی پر تھا جیسے کسی بچے کو دودھ پلانے والی ہو اور دوسرا ہاتھ یوں کھلا تھا جیسے کسی شے کو تھامنے کے لیئے اٹھا ہو۔ اس کے پس منظر میں تاریک آسمان تھا جہاں سینکڑوں چاند، ستارے، سورج ایک دیوانی لگن میں گردش کر رہے تھے۔

ٹھک ٹھک ٹھک۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ انور تصویر دیکھتا رہا۔ وہ دم بخود سا ہو کر کھڑا تھا۔ اُسے دروازے کی دستک بالکل نہ سنائی دی۔ نجمہ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور ناشتے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی۔

"چائے پی لیجئے!"

"رکھ دو"

انور نے سگریٹ سلگالیا۔

"پہلے چائے پی لیجئے!"

انور نجمہ کو غصّے میں "نکل جاؤ" کہنے ہی والا تھا کہ وہ سنبھل گیا۔ نجمہ چائے بنارہی تھی۔ انور نے بڑی رحمدل آنکھوں سے نجمہ کو دیکھا اور اس کے پاس کرسی پر جاکر بیٹھ گیا۔ وہ نجمہ سے اب محبت بالکل نہیں کرتا تھا۔ دراصل اُسے نجمہ سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ اُسے نجمہ کے جسم نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور اگر یہاں ماڈل مل جایا کرتے تو وہ نجمہ کے جسم کی طرف بھی اتنی سنجیدگی سے متوجہ نہ ہوتا کہ آخرکار اُسے نجمہ سے شادی کرنی پڑ جاتی۔ لیکن وہ نجمہ کی وفاشعاری اور ایثار سے بے حد متاثر تھا۔ وہ نجمہ کو زندگی میں کبھی کوئی رنج نہ پہنچانا چاہتا تھا۔ اُس کے خیال میں محبت بکواس ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے مگر اسے ہر روز پریشان کرتا ہے اور اس کی ضرورتوں کی نگہداشت نہیں کر سکتا تو وہ گدھا ہے۔ اس کے برعکس وہ آدمی زیادہ بہتر ہے جو بیوی سے محبت وغیرہ بالکل نہیں کرتا لیکن بیوی کو بیوی سمجھتا ہے اس کا خیال رکھتا ہے۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اہمیت دیتا ہے۔ اسی لئے انور محبّت کی شادی کے سخت خلاف تھا حقیقت میں وہ شادی ہی کا قائل نہیں تھا۔ مگر چونکہ یہاں شادی کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں اس لئے اس کے خیال میں یہ بڑا ضروری تھا کہ ایک آدمی شادی سے پہلے ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرے کہ عورت شادی کے بعد اپنی کشش اور جنسی لطافت کھو دیتی ہے۔ وہ بیوی ہو کر رہ جاتی ہے اور بیوی کبھی صحت مند نہیں ہوتی۔ کبھی خوبصورت نہیں ہوتی۔ کبھی محبوبہ نہیں ہوتی۔ کبھی میٹھی میٹھی باتیں نہیں کرتی۔ وہ لاکھ سولہ سنگار کرے، وہ کبھی برجی باردوت اور الزبتھ ٹیلر نہیں بن سکتی لیکن وہ آپ کے اور آپ کے بچوں کے لیے اپنی جان قربان کر سکتی ہے اسی اعتبار سے بیوی کے پاس مردوں کو رومان کے لیے نہیں بلکہ حقیقی محبت کا سبق سیکھنے اور جنسی تسکین کے لیے نہیں بلکہ جنسی اعتدال کے لیے جانا چاہیے۔

انور کا جی چاہا کہ وہ نجمہ کو دھوکے میں نہ رکھے۔ اسے صاف صاف بتادے کہ وہ خانہ بدوش لڑکی گلنار سے پیار کرنے یا چاہنے یا اسے کچھ وقت کے لیے اچھا سمجھنے لگا ہے۔ لیکن وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے معلوم تھا نجمہ اُسے کچھ نہ کہے گی۔ کبھی گلنار کو ملنے سے منع نہیں کرے گی۔ کبھی اس بات پر پھوہڑ بیویوں کی طرح انور سے لڑائی کرنے نہیں بیٹھے گی جیسا کہ عام طور پر بیویاں کیا کرتی ہیں۔ اور جیسا کہ عام طور پر ایسی بیویاں خاوندوں کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہیں۔ مگر ہتا وہ ضرور جانتا تھا کہ نجمہ اندر ہی اندر اس روگ کو لے کر بیٹھ جائے گی اور یہ صدمہ مرض الموت بن کر ایک دن اسے قبر میں لے جائے گا۔ خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ نجمہ پر دق کا حملہ ہو چکا تھا۔ انور نے نجمہ کو خود پیالی بنا کر دی اور بولا۔

"اگر تمہیں میری کسی بات سے صدمہ پہنچا ہے
نجمہ تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

نجمہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے۔ انور نے پیالی میز پر رکھ کر اُسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ نجمہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا چشمہ جاری ہو گیا۔

"نہیں نجمہ! روتا نہیں۔ یہ باتیں زندگی کے بہت بڑے حقائق ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ ایسا ضرور ہوا کرتا ہے۔ ہم دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں۔ دوسروں کے بنائے ہوئے اصول اور پیمانے ہم پر صادق نہیں آتے۔ میں سب سے الگ، سب سے دور رہتا ہوں۔ پھر بھی تم سے بہت قریب ہوں۔ دنیا میں ایک تم ہی وہ ہستی ہو جو میرے اس قدر نزدیک ہے اور جس کا میں اتنا خیال رکھتا ہوں اور جسے میں کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتا۔"

نجمہ نے رومال سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا

"میرا ابھی سوائے آپ کے اور اس دنیا میں کون ہے۔ اباجی ہیں تو وہ میرے درد کا علاج تو کر

سکتے ہیں۔ اس کا مداوا نہیں کر سکتے، میرے دکھ
درد میں سوائے آپ کے اور کون ہے۔ پھر میں
آپ سے محبت بھی کرتی ہوں۔ زندگی میں
کبھی آپ سے الگ نہیں ہونا چاہتی۔ میں
تو آپ کے بغیر گزرنے والی زندگی کا تصور
بھی نہیں کر سکتی۔ آپ کو پریشان دیکھتی ہوں
تو خود بھی پریشان ہو جاتی ہوں۔ آپ کو فکرمند
دیکھتی ہوں تو اپنی ساری خوشیاں
بھول جاتی ہوں میری خوشیاں، میرا سکون اور
میری ساری باتیں صرف آپ ہی کے دم سے
ہیں۔ آپ جس سے چاہیں پیار کریں جس سے
چاہیں ملیں۔ لیکن مجھے اپنے سے جدا نہ کریں
میں آپ کی جوتیوں میں بیٹھی رہوں گی۔ میں کواڑ
کے ساتھ لگی آپ کو دیکھ لیا کروں گی مجھ سے
سب کچھ چھین لیں مگر آپ کو دیکھتے رہنے
آپ کے قریب رہنے اور آپ سے محبت
کرتے رہنے کا حق نہ چھینیں۔"

انور نجمہ کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا۔ اُس نے اپنے دل میں کسی عورت کے متعلق کبھی اتنا گداز اور اتنی ہمدردی محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے نجمہ کو اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ دیر تک اس کے شانوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتا رہا اور سوچتا رہا وہ کن راستوں پر چل نکلا ہے۔ اس لڑکی کو اس نے اپنی تباہ کُن طوفانی زندگی کے سفر کے لئے کیوں اپنے ساتھ کر لیا۔ ہو سکتا ہے اسے انور سے زیادہ اچھا زیادہ موزوں ساتھی مل جاتا۔ ہو سکتا تھا نجمہ کسی دوسرے مرد کے گھر میں ہوتی تو اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ آتے۔ اُس پر کبھی تپ دِق کا حملہ نہ ہوتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے تیر کمان سے نکل کر نشانے پر جا بیٹھا ہے۔ دریا اپنے دہانے سے نکل

کر پہاڑی راستوں، میدانوں اور صحراؤں کی خاک چھانتا سمندر سے جاملا ہے۔ نجمہ اس کی زندگی میں داخل ہو چکی ہے اور اب موت یا طلاق ہی انور سے جدا کر سکتی ہے۔ موت اس کے بس میں نہیں اور طلاق وہ کبھی دے نہیں سکتا۔

پھر کیا ہو؛ پھر کیا ہو!

کچھ نہیں، کچھ نہیں، جو ہونا چاہئیے وہ ہو رہا ہے۔ جو ہوگا ٹھیک ہوگا، اُسے ایسا ہی ہونا چاہئیے اور ایسا ہی ہوگا۔ اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔

دوسری رات انور سویا رہا لیکن منہ اندھیرے سیر کے بہانے پھر دریا پار کر کے چیڑ کے جنگل والے چشمے کی طرف نکل گیا۔ اُسے یقین تھا گلنار وہاں پانی بھرنے ضرور آئے گی چشمے پر وہ بہت پہلے پہنچ گیا تھا۔ ابھی پو ہی پھٹی تھی اور سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ درختوں کے اوپر ستارے طلوع ہونے والے صبح کی اولین روشنی میں ماند پڑتے جا رہے تھے۔ ہوا میں درختوں کی خوشبو اور اوس کی نمی تھی۔ انور نے ہلکی ہلکی روشنی میں چیڑ کے پرانے درخت کے تنے پر گلنار کا ادھ کھدا نام دیکھا اور چاقو سے کھودنے لگا۔ جب نام پوری طرح کھُد گیا تو اس نے بے اختیار ہو کر اُس نام پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ کھُردرے تنے کی چھال میں اُسے ایک عجیب سی خواب انگیز نرمی گدگداہٹ اور مٹھاس کا احساس ہوا۔ جب سورج کی کرنوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے اُچھل کر وادیوں میں قدم رکھا تو انور نے گلنار کو چشمے پر آتے دیکھا۔

انور درخت پر ہاتھ رکھے پاگلوں کی طرح گلنار کو چشمے پر آ کر منہ پر چھینٹے مارتے اور مٹکے میں پانی بھرتے دیکھتا رہا۔ گلنار نے چشمے میں جُھک کر اپنے بال ٹھیک کئے اور مٹکا اٹھا کر واپس چل پڑی۔ انور درختوں سے باہر نکل آیا اور گلنار کے تعاقب میں اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ پھر وہ پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف سے پگڈنڈی کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا اور گلنار کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے گھاس میں اُگا ہوا ایک بسنتی پھول توڑ کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ اس پھول کو جنگل کی مہارانی کے حضور میں پیش کرنا چاہتا تھا۔

جب گلنار نے پگڈنڈی کا موڑ گھومتے ہوئے انور کو اپنے سامنے دیکھا تو وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اِن دونوں کے درمیان کوئی پندرہ قدموں کا فاصلہ تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہوں

پر کھڑے ایک دوسرے کو خاموش اور پُراسرار نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر انور بسنتی پھول ہاتھ
میں لے کر گلنار کی طرف بڑھنے لگا۔ گلنار چپ چاپ بُت بنی کھڑی انور کو اپنی طرف آتے دیکھتی
رہی۔ قریب آ کر رُک گیا۔ اس نے پھول والا ہاتھ گلنار کی طرف بڑھا کر کہا۔

"میرے دل نے اپنا ہاتھ تمہاری طرف پھیلا دیا
ہے گلنار! میرے ہاتھ کی ہر انگلی، انگلی کے
ہر ذرّے میں ایک دل دھڑک رہا ہے۔ میرے
ہاتھ میں یہ پھول میری محبت کا خواب ہے
جو ہزار آنکھ سے تمہیں دیکھ رہا ہے۔ میرے
ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دو۔ میرے پھول کو
اپنے سیاہ بالوں میں سجا لو۔ تیرے بال سیاہ
جنگل کی تاریک رات ہے۔ جو زلفِ پریشاں
کے سُورج کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ میں تم
سے محبت کرتا ہوں۔ جس طرح بگولے اپنے
ساتھ اڑنے والی ریت سے جنگل اپنے درختوں
میں چلنے والی ہوا سے اور درخت اپنے تنے
پر چڑھی ہوئی پھولدار بیل سے محبت کرتے
ہیں۔"

انور محبّت اور جنس کے ازلی اور وحشی جذبے میں ڈوب کر گلنار کی طرف بڑھ رہا تھا اور
گلنار آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ نہ گلنار کی کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور نہ انور کی کچھ سمجھ رہا تھا۔
دونوں عقل اور دور اندیشی کے طعنوں سے پاک ذہن لئے آگے بڑھ رہے تھے، پیچھے ہٹ
رہے تھے۔

"تم بھی مجھ سے محبّت کرتی ہو۔ تم بھی مجھے
چاہتی ہو۔"

"نہیں نہیں۔ نہیں نہیں۔"

"ہاں ہاں۔"

"میں میں تمہیں بالکل نہیں جانتی۔"

"تم مجھے مجھ سے زیادہ جانتی ہو گلنار! تم ہر
رات میرے خواب دیکھتی ہو۔ ہر رات مجھے
ملنے کی امید لے کر سوتی ہو اور ہر صبح چشمے
پر آ کر تیری آنکھیں چاروں طرف مجھے تلاش کرتی
ہیں۔ تم اپنے دل کو کبھی نہیں جھٹلا سکتیں۔ تم
مجھ سے آنکھیں پھیر سکتی ہو مگر اپنی آنکھوں سے
میرے خیال کو کبھی نہیں نکال سکتیں۔"

"میں نہیں جانتی تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا کہنا چاہتے
ہو۔ میں خانہ بدوش ہوں۔ میری محبّت دریا
پر جھکا ہوا کنول کا پھول ہے۔ جو ہر لہر سے محبّت
کرتا ہے اور کسی لہر کا ساتھ نہیں دیتا۔"

انور نے گلنار کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہیں ابھی تک وہ لہر نہیں ملی جو تمہارے پھُول
کو توڑ کر اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گی۔"

گلنار نے اپنا ہاتھ چھُڑانا چاہا مگر انور نے گرفت مضبوط کر لی۔

"جب مجھ سے دل نہیں چھُڑا سکتیں تو ہاتھ
چھڑانے کی کوشش کیوں کرتی ہو۔ تم ایک قدم
پیچھے ہٹاتی ہو اور دو قدم میری جانب اٹھاتی
ہو۔ اگر میرے جسم کے ذرّے ذرّے پر گلنار کا
نام کندہ ہے تو تمہارے دل میں بھی انور کا

تصور خون بن کر دھڑک رہا ہے۔"

انور نے گلنار کا مٹکا تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے گلنار کا ہاتھ تھام کر اسے پگڈنڈی عبور کر کے جنگل کے درختوں میں لے گیا۔ یہاں اس نے مٹکا زمین پر رکھا اور گلنار کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ گلنار کا شگفتہ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گہری گہری آنکھوں میں نامکمل خوابوں کے سنہری بادل تیر رہے تھے۔ ایک پل کے لئے وہ انور سے مسحور ہو گئی اور اس نے یوں انور کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جس طرح سورج مکھی کا پھول سورج کی طرف بے اختیار منہ اٹھا دیتا ہے۔ انور نے جھک کر گلنار کے شہد بھرے ہونٹوں پر اپنے پیاسے ہونٹ رکھ دیئے خانہ بدوش لڑکی کا جسم سر سے لے کر پاؤں تک کپکپا گیا۔ اس کے گرم ہونٹ تو گرفتار کبوتری کی طرح پھڑک رہے تھے۔ انور کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے صندل کے تازہ کٹے ہوئے تنے پر منہ رکھ دیا ہو۔ جیسے اس کے ہونٹ پھٹی ہوئی دھرتی کے خشک کناروں کو چوم رہے ہوں۔ جیسے اس نے جاڑے کی روشن دھوپ میں نیم گرم سرخ انگوروں کے گچھے میں اپنا منہ چھپا دیا ہو۔ جیسے وہ زمین پر کھڑا ستاروں کو چھو رہا ہو۔ چاند کے ٹھنڈے اور گرم سینے پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے ہو۔ جیسے سورج کے جوالا مکھی میں سے اچھلتے ہوئے لاوے کے پھولوں کو ہاتھوں میں لے رہا ہو۔ اسے اپنے ہونٹوں پر قوسِ قزح کا ست رنگا مخمل سرسراتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پھولوں کے ڈھیر میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر گلنار کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے ساتھ ہی تاریک آسمان پر ان گنت سورج لال لال نارنجیوں کی شکل میں چکر کھانے لگے جنگل پر سپید سپید پھولوں کی بارش ہونے لگی جہلم کے پانیوں نے جھاگ اڑانا شروع کر دی۔ اور جھاگ کے گالے اڑ اڑ کر ساحلی جنگلوں میں براق کبوتروں کی مانند فضا میں پرواز کرنے لگے۔ انور کو اپنے سارے جسم پر ایک ایسے پھل کا گمان ہونے لگا جس کی سطح زیادہ پک جانے سے پھٹ گئی ہو اور جگہ جگہ سے رس کا شہد بہنے لگا ہو۔ اس کے ذہن میں اپنی ساری تصویریں تصویروں کے سارے رنگ، رنگوں کی ساری قوسیں، سارے خطوط، سارے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے گردش کرنے لگے۔ پورا جنگل ایک ہرن تھا جس کے سیاہ نافے کا منہ کھل گیا تھا اور جادو گر خوشبو پھول بن کر اڑی جا رہی تھی۔ اڑی جا رہی تھی......

اچانک گلنار پیچھے ہٹ گئی۔

اور انور نے دیکھا اس کے ادھ کھلے ہونٹوں پر محبت کے نامکمل خواب کا خمار ٹوٹ رہا تھا اس کی آنکھیں بوجھل بوجھل تھیں۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ چاند ایسے ماتھے پر زلف کی سیاہ لٹ دل کے ساتھ ساتھ دھڑک رہی تھی۔ اس نے جلدی سے مٹکا اٹھایا۔ اور پگ ڈنڈی عبور کر کے سامنے والے پہاڑ کے درختوں میں گم ہو گئی۔ انور بت بنا وہاں کھڑا رہا۔ اور گلنار کو جنگل میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ اسے اپنے آپ پر اس دریا کا گمان ہو رہا تھا۔ جو پھولوں بھری وادیوں سے نکل کر اچانک صحرا میں آ کر خشک ہو گیا ہو۔

اس رات انور نے خانہ بدوش لڑکی کے بوسے کی تصویر بنائی۔ اس تصویر کے سارے رنگ امتزاجی تھے۔ کوئی رنگ بھی اپنی صحیح حالت اور اصلی شکل میں نہ تھا۔ اس تصویر میں ایک اندھی آنکھوں والے نسائی چہرے کے ہونٹ تکون کی شکل میں کھلے تھے اور تکون کے عین وسط میں ایک سرخ پھول بنا ہوا تھا جس کی مخملیں پنکھڑیوں پر کانٹے ابھرے تھے۔ عورت کے سر پر کئی سیاہ ناگ سرخ زبانیں نکالے پھنکار رہے تھے۔ انور نے اس تصویر کا نام "خانہ بدوش لڑکی کا بوسہ" رکھا۔

اگلے روز انور پھر صبح سویرے چشمے پر پہنچ گیا۔ وہ کافی دیر تک وہاں چکر لگاتا رہا مگر گلنار کہیں دکھائی نہ دی۔ یا وہ آئی ہی نہیں تھی۔ اور یا پھر بڑی سویرے پانی بھر کر لے گئی تھی۔ بہر حال انور کو ناکام واپس آنا پڑا۔ دوسرے دن پھر انور گلنار سے ملاقات نہ کر سکا۔ تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔ انور بے قرار ہو گیا۔ چوتھے روز وہ منہ اندھیرے ہی ڈاک بنگلے سے نکل آیا اور خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں کے پاس ذرا ہٹ کر درختوں کی اوٹ میں بیٹھ رہا۔ اس انتظار میں کہ گلنار ضرور وہاں سے گزرے گی۔ اسے وہاں بیٹھے ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ ہی ہوا ہو گا کہ ایک جھونپڑے کا پردہ ہٹا اور ایک سایہ سا باہر نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ انور پہاڑی پگ ڈنڈی پر آگے چل پڑا۔ تھوڑی دور جا کر وہ ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا آنے والے سائے کا انتظار کرنے لگا جو اس کے خیال میں یقیناً گلنار ہی تھی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ جب وہ سایہ قریب سے گزرنے لگا تو انور نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ گلنار تھی۔ انور نے اس کا راستہ روک لیا۔

"تم اگر رات کے ایک بجے بھی چشمے پر پانی
بھرنے نکلو گی تو انور کو راستے میں پاؤ گی۔"
گلنار کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ انور باتیں کرتا گیا اور وہ بے چین نگاہوں سے چاروں طرف
دیکھتی رہی۔

"خدا کے لیے بابو یہاں سے چلے جاؤ میرا
پیچھا چھوڑ دو۔"
"کیوں!
"وہ لوگ تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔"
"تمہاری خاطر مجھے یہ انجام بھی قبول ہے۔"
"نہیں بابو! تمہیں میری قسم، پھر یہاں نہ آنا۔"
انور نے جلدی سے گلنار کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
"ایسا پھر نہ کہنا گلنار! تمہاری خاطر میں اس
جنگل کے سارے درخت کاٹ کر پھینک
سکتا ہوں۔ تمہاری خاطر میں آسمان کے ستارے
نوچ سکتا ہوں ہواؤں کے رخ موڑ سکتا
ہوں۔ اپنی جان پر کھیل سکتا ہوں۔ مگر تمہیں
ملنا نہیں چھوڑ سکتا۔ خدا کے لیے مجھے پھر
اپنی قسم نہیں دینا کیونکہ پھر مجھے وہ کام کرنا ہی
پڑے گا۔ اور میں تمہیں ملنا کبھی ترک نہیں
کر سکتا۔"
گلنار نے عاجزی سے پوچھا۔
"آخر کیوں؟"
انور نے گلنار کا ہاتھ چوم کر کہا۔

"اس لئے کہ تم میری زندگی کا سانس ہو، دل
کی دھڑکن ہو۔ آنکھوں کی روشنی اور خون کی
گرمی ہو۔ رات چاند کے بغیر رات کہلا سکتی
ہے مگر دن سورج کے بغیر دن کبھی نہیں کہلا
سکتا۔ تم میرا سورج ہو۔ تم ہو تو میں بھی ہوں
تم نہیں ہو تو میں بھی نہیں ہوں۔ پھول خوشبو
کے بغیر پھول کہلا سکتا ہے مگر یہ کبھی نہیں
ہو سکتا کہ خوشبو موجود ہو اور پھول کہیں دکھائی
نہ دے۔ میں تمہاری خوشبو ہوں اور تم میرا پھول
ہو گلنار! ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنا سب
کچھ چھوڑ دوں۔ مگر ایسا کبھی نہیں، کبھی نہیں
ہو سکتا کہ میں تمہیں ملنا چھوڑ دوں۔"
گلنار گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کے چہرے پر ابھی نیند کا خمار باقی تھا۔ ذرا سا کھٹکا ہوا
گلنار وحشی ہرنی کی طرح چونک اٹھی۔ اندھیرے میں اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں چمکنے
لگیں۔ انور کو اس وقت گلنار کے خانہ بدوش لڑکی ہونے کا شدید احساس ہوا۔ جب گلنار کو
یقین ہو گیا کہ ارد گرد کوئی نہیں تو اس نے اچانک انور کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
انور حیران رہ گیا۔

"بابو! میرا خیال چھوڑ دو۔ دیکھو! ہم جنگل کے
باسی ہیں۔ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں اور جب
ٹھکانہ نہ ہو تو انسان کا بہت سی باتوں
پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اس دربدری
کی زندگی نے ہمیں دوسری کئی باتوں کے علاوہ
ایک یہ بات بھی سکھائی ہے کہ محبت نام کی

شے کوئی نہیں ہوتی۔"

انور نے گلنار کو سینے سے لگا لیا۔

"تم غلط کہتی ہو۔ تم اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ عورت وہ خانہ بدوش ہو کہ گھر کی چار دیواری میں رہتی ہو، محبّت کرنا کبھی نہیں بھول سکتی۔ روشنی کتنی ہی مدّھم کیوں نہ ہو جائے مگر اپنی کرن سے بیزار نہیں ہو سکتی۔ دریا کنارے سے کتنا ہی بے تعلق کیوں نہ ہو جائے مگر اس کا پانی اپنے کناروں سے ضرور ٹکراتا رہے گا۔ تم مجھ سے محبّت کرتی ہو اور تم اس بات کو چھپا نہیں سکتیں۔"

گلنار نے انور کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ انور کو الائچی کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔

"خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میں کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

انور نے گلنار کا ہاتھ پکڑ کر اس کے دل پر رکھ دیا۔

"اس دل کی قسم کھا کر کہو، کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں، بولو گلنار! کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

گلنار نے اپنا سر انور کے سینے سے لگا دیا۔

"تم مجھ سے وہ کام کروانا چاہتے ہو، جس کا انجام سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں۔ تم مجھے اس راستے پر کھینچے لئے جا رہے ہو جس

کے اختتام پر موت کا سایہ ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔"

انور نے گلنار کے چہرے پر لاتعداد بوسے دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہاری آغوش میں آئی ہوئی موت قبول ہے گلنار! میں تمہارے ہاتھ سے آئی ہوئی موت کو خوش آمدید کہوں گا۔ اس کا خیر مقدم کرونگا۔"

"نہیں نہیں بابو! تمہیں ایسا نہیں کرنا ہوگا تم ایک بیوی کے خاوند ہو۔ تمہاری بیوی کی زندگی تم سے وابستہ ہے ایک عورت کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہے۔ تم اُسے دھوکہ نہیں دوگے۔ تم اس کی زندگی برباد نہیں کرو گے۔ تمہیں مجھے بھلا دینا ہوگا مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دینا ہوگا۔"

انور نے دونوں ہاتھوں سے گلنار کے بازوؤں کو بھینچ لیا۔ اُس نے گلنار کو اپنے سینے سے لگا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ انور نے ایک گہرا سانس لے کر آہستہ آہستہ کہا۔

"گلنار! میں اس وقت صرف انور ہوں انور پینٹر، انور غیر خاوند، غیر بھائی اور غیر داماد ۔۔۔ جو کسی کا کبھی کچھ نہیں لگتا۔ جس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں جس نے کبھی کسی کو کیسی بھی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ جس نے ہمیشہ فطرت کے غیر انسانی مظاہر سے پیار کیا ہے اور اس کے انسانی مظاہر میں سے صرف عورت سے محبّت کی ہے۔ وہ عورت جو کبھی کسی کی

بیوی، بہن یا ماں نہیں بن سکتی جو نیچر کی امانت
ہے اور ازل سے ابد تک نیچر کی ہی بن کر
رہے گی۔ میں انور تم سے پیار کرتا ہوں۔ اس
لئے کہ تم بھی قدرت کے انہی مظاہر میں سے
ہو۔ خاوند انور تمہارے پاس کبھی نہیں آیا
وہ ہمیشہ نجمہ کے گن گاتا ہے اور اُسی کے گن
گاتا رہے گا۔ وہ صرف نجمہ کا ہے اور ہمیشہ نجمہ
ہی کا رہے گا۔"

گلنار نے کہا۔

"تم اس قسم کی باتوں سے اپنے من کو بہلا سکتے
ہو۔ اپنے ضمیر کو تسلّی دے سکتے ہو۔ لیکن عورت
کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ عورت جب بیوی
بن جاتی ہے تو پھر اپنے خاوند کی سر سے
پاؤں تک مالک ہوتی ہے۔ اور مالک ہی
رہنا چاہتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم
محبّت مجھ سے کرو اور گھر نجمہ کے رہو۔"
"میں نجمہ کو چھوڑ دوں گا۔ میں تمہارے ساتھ
چلا جاؤں گا۔ تم جہاں جاؤ گی میں تمہارے
ہمراہ رہوں گا۔"
گلنار نے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔
"ایسا کبھی نہ سوچنا۔ اوّل تو تمہیں اپنی بیوی
کو کبھی بھی کسی بھی حال میں نہیں چھوڑنا چاہیے
اس لیے کہ تمہارے اس پریم ناٹک میں

اس بیچاری کا کوئی قصور نہیں ہے۔ دوسرے
یہ کہ تم میرے ساتھ کبھی نہیں جا سکتے۔"
"کیوں نہیں جا سکتا؟"
"اس لیے کہ تم ہم میں سے نہیں ہو۔"
انور نے جلدی سے کہا۔

"میں بھی خانہ بدوش بن جاؤں گا۔"
"انسان خانہ بدوش بنا نہیں کرتا۔ وہ خانہ
بدوش ہوا کرتا ہے۔"
اتنے میں جنگل میں شڑاپ کا پٹاخہ چھوٹا اور اس کے ساتھ ہی خانہ بدوشوں کے
سردار شمور کی کرخت آواز گونجی۔

"اور خانہ بدوش اپنی بے عزّتی کا انتقام لینا
بھی خوب جانتے ہیں۔"
گلنار کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ انور نے چونک کر دیکھا سامنے درختوں کے درمیان
خالی جگہ پر خانہ بدوشوں کا سردار ہنٹر ہاتھ میں لہراتا کھڑا تھا اور اس کے آس پاس دس بارہ
خانہ بدوش خنجر سونتے حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ شمور کی آواز پھر گونجی۔
"کیوں گلنار! کیا اسی لیے صبح صبح خیمے سے
نکل جایا کرتی تھیں؟ لیکن آج کے بعد تمہیں
اتنی سویرے تکلیف کرنے کی ضرورت محسوس
نہیں ہو گی۔"
ساتھ ہی سردار نے گلنار کو کھینچا اور گھسیٹتا ہوا دوسری طرف لے گیا۔ اس کے بعد اس نے
چیخ کر اپنے جوانوں سے کہا
"تم لوگ اپنا کام کیوں نہیں کرتے ہو؟"
قریب تھا کہ دس بارہ خنجر آن کی آن میں انور کے جسم کی تکا بوٹی کر دیں کہ گلنار کی آواز گونجی

"خبردار ——— شموُر! اگر بالو کا خون ہوُا تو یہ
خنجر میرے سینے میں بھی اُتر جائے گا۔"

انور اور سردار نے دیکھا کر سامنے چھوٹا سا خنجر ہاتھ میں لئے اس کی نوک اپنے سینے پر رکھے گلنار کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر وحشی درندوں ایسی چمک اور پہاڑوں ایسی ہیبت تھی سردار نے ایک پل کے لئے گلنار کو اور پھر انور کو دیکھا۔ منہ میں کچھ چباتے ہوئے ایک طرف زور سے تھوکا اور ہنٹر لپیٹ کر بولا۔

"واپس چلو۔"

سردار گلنار کو ساتھ لے کر اپنے سارے آدمیوں سمیت وہاں سے چل دیا۔ انور اکیلا رہ گیا ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں پھر وہی خاموشی چھا گئی ——— پھر پہاڑیوں کے اوپر سے سورج دیوتا نے جھانک کر وادی میں دیکھا اور وادی کا ذرّہ ذرّہ جگمگا اٹھا۔ درختوں پر چڑیاں چہچہانے لگیں اور کچی پگ ڈنڈیوں پر گوالے مویشیوں کو لے کر چل پڑے۔ انور نے چونک کر اپنے ارد گرد دیکھا اور دونوں ہاتھ جیبوں میں دے کر واپس روانہ ہو گیا۔

۹

سارا دن انور کی عجیب حالت رہی۔

اُس نے نجمہ سے بھی کوئی بات نہ کی۔ پہلے تو دوپہر تک اپنے کمرے میں بند رہا۔ تھوڑا سا کھانا کھایا اور پھر کمرے میں اپنی تصویریں سامنے دیوار سے لگا کر دیکھتا رہا۔ نجمہ یہ سمجھتی رہی کہ اس کے آرٹسٹ خاوند کا موڈ ٹھیک نہیں اور اُس کے ذہن میں کسی نئی تصویر کا ہیولہ تشکیل پا رہا ہے۔ پھر بھی اس نے دو ایک بار انور سے پوچھ ہی لیا کہ وہ آج پریشان کیوں ہے؟

"پریشان! بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔"

نجمہ پھر ادھر ادھر کے کاموں میں لگ گئی۔ انور نے گلنار کی دونوں تصویروں پر نظریں جما دیں اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونکنے شروع کر دئیے۔ پھر وہ کمرے میں ہاتھ پشت پر باندھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

اس کا ذہن ایک بڑے نازک مقام پر آکر ایک بات کا فیصلہ کر رہا تھا۔ انور کی قوتِ فیصلہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ مفلوج سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آخری قدم کیونکر اُٹھائے گلنار کا تصور آگ کا بگولہ بن کر اس کے دل و دماغ میں چکر کھا رہا تھا۔ اس کے کان سنسنا رہے تھے اُسے ابھی تک خانہ بدوش کے سردار کی گونج دار آواز اور ہنٹر کی زوردار شڑاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ گلنار کو خنجر کی نوک اپنے سینے پر رکھے

دیکھ رہا تھا۔ اس نے انور کی جان بچائی تھی۔ وہ انور سے بے حد پیار کرتی ہے۔ اس نے صرف انور کی زندگی بچانے کے لئے اپنی زندگی اجیرن کر لی تھی۔ خدا جانے وہ ظالم سردار گلنار کو کس کس طرح اذیت نہیں دے رہا ہو گا۔

انور کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ بے قرار ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی جا کر گلنار کو اس وحشی سردار کے پنجے سے چھڑا لے۔ لیکن باہر دہلیز پر نجمہ اس کا راستہ روکے ہوئے تھی۔ اپنی اس کمزوری پر انور جھلا اٹھا۔ مگر گلنار سے اتنی شدید محبت بھی تو انور کی کمزوری ہی تھی۔ پھر نجمہ کا اس میں کیا قصور تھا۔

لیکن گلنار اس کی بیوی نہیں تھی۔ کاش نجمہ انور کی بیوی نہ ہوتی۔ پھر شاید وہ کبھی نجمہ سے بیزار نہ ہوتا۔ یا شاید پھر کبھی اسے گلنار کی طرف جانے کا خیال پیدا نہ ہوتا۔ وہ گلنار سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔ کیا اس دنیا میں کہیں بھی، کسی کونے میں بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ دو انسان، دو محبت کرنے والے شادی کئے بغیر اپنی مرضی سے زندہ رہ سکیں؟ کیا ایک جگہ اکٹھے رہنے کے لئے شادی ضروری ہے؟ انور تو یہ چاہتا تھا کہ وہ جتنی دیر چاہے ایک عورت کے ساتھ رہے، اور جب اس کا جی اس سے بھر جائے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے پاس چلا جائے۔ لیکن اس کا معاشرہ اس بات کی آزادی نہیں دیتا تھا۔ کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ انور آزاد جنسی تعلقات رکھتے ہوئے بھی اخلاقی قدروں کی حدود سے باہر نہیں جا سکتا تھا مگر دوسرے لوگ ایسا نہیں کر سکتے تھے اور قانون ہمیشہ اسی قسم کے دوسرے لوگوں کے لئے ہوتا ہے۔ انور ایسے لوگوں کے لئے نہیں۔ ایسے لوگوں کا تو ہر فعل قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود کثرت کے اس ہجوم میں وحدت کو گم ہونا ہی پڑتا ہے۔ گھن کے ڈھیر کے ساتھ اس اکیلے گیہوں کو بھی پسنا ہی پڑتا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا انور کے دل میں گلنار کی محبت اور اس سے ملنے کا جذبہ بہ فزوں تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا اور دماغ پریشان خیالات میں الجھتا چلا جا رہا تھا۔ جس طرح ہرنی کا نازک بچہ کانٹوں کی جھاڑیوں میں گر پڑے

اور وہ باہر نکلنے کی جتنی کوشش کرے، اتنا ہی زخمی ہوتا چلا جائے۔

شام کے سائے وادی پر پھیلنا شروع ہو گئے تھے کہ انور کا دل ایک دم بے چین ہو گیا۔ نجمہ ایک سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی وہ ڈاک بنگلے کے خالی کمروں کے چکر لگانے لگا۔ وہ تصویروں والے کمرے میں آیا۔ اس نے اپنی ایک ایک تصویر کو سامنے رکھ کر اچھی طرح دیکھا۔ جس طرح آدمی پردیس پر جاتے ہوئے اپنے بچوں سے ملتا ہے۔ پھر اس نے کاغذ قلم نکالا اور نجمہ کے نام ذیل کا خط لکھا۔

"نجمہ!

میں جا رہا ہوں۔ کیوں جا رہا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ ان سوالوں کا میں تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا اس لئے کہ یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ میں تمہیں صدمہ پہنچا کر جا رہا ہوں۔ اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ شاید میں پیدا ہی دنیا میں دوسروں کو صدمہ پہنچانے کے لئے ہوا ہوں۔ میری جدائی کو صبر کے ساتھ برداشت کر لینا۔ میں اس خط کے ساتھ ہی ایک الگ کاغذ پر تمہیں آزاد کر رہا ہوں۔ اب شاید زندگی میں پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔

انور"

خط لکھنے کے بعد انور نے ایک سادہ کاغذ پر نجمہ کے نام طلاق نامہ لکھا۔ دونوں کاغذ ایک لفافے میں بند کر کے میز پر رکھے اور لمبا کوٹ پہن مفلر اوڑھ باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا کوٹ کی اندرونی جیب میں گوشت کاٹنے والی لمبی چھری رکھی ہوئی تھی۔ چھری کو ہاتھ سے چھونے سے انور کو تسلی ہو

گئی۔ اب وہ بڑی تیزی کے ساتھ پہاڑی راستوں اور وادی کی پُرپیچ راہگذاروں میں سے ہوتا ہوا گلنار کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کے سردار کا خاتمہ کر دے گا۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ گلنار کو اس کے بعد وہاں سے بھگا کر لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گلنار کو ساتھ لے کر کسی دوسرے علاقے کی طرف نکل جائے گا۔

بہر حال ایک بات اُس نے طے کر رکھی تھی کہ وہ سردار شمور کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔ کیونکہ ایک تو وہ اس کا رقیب تھا، دوسرے وہ گلنار پر ظلم و ستم کر رہا تھا۔

جب وہ دریائے جہلم کا لکڑی کا پل عبور کر رہا تھا تو رات چھا گئی اور شام کے سائے رات کے سایوں میں تبدیل ہو گئے۔ پھر بھی آسمان ابھی تک نیم روشن تھا اور وہاں غروب ہوتے سورج کی روشنی باقی تھی۔ انور پل عبور کر کے تیزی سے ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔

اس ٹیلے کی دوسری طرف خانہ بدوشوں کا ڈیرا تھا۔ انور نے یہاں پہنچ کر ایک بار پھر جیب میں چھری کو ہاتھ سے اچھی طرح محسوس کیا اور تیزی سے ٹیلے کی چڑھائی طے کر گیا۔ جب انور ٹیلے کا چکر کاٹ کر سامنے میدان میں آیا تو وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

سامنے چیڑ کے درختوں کے درمیان ایک بھی خیمہ نہیں تھا۔ خانہ بدوش وہاں سے کوچ کر گئے تھے۔ انور پاگلوں کی طرح نیچے اُتر کر میدان میں گیا۔ الاؤ میں بجھی ہوئی، راکھ اور جلی بجھی لکڑیوں کے علاوہ وہاں اور کچھ نہیں تھا۔

انور سر پکڑ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ گلنار اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ ان کا قافلہ رخصت ہو گیا تھا۔ خدا جانے وہ کب یہاں سے چلے تھے اور اب کس مقام پر ہوں گے۔

انور کچھ دیر وہاں اداس بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ وہاں گہری خاموشی طاری تھی۔ صرف بائیں جانب چیڑ کے جنگل کی طرف سے درختوں میں پرندوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

وہ اب کیا کرے؟ کیا واپس گھر چلا جائے؟ لیکن گھر کا ناطہ تو وہ توڑ آیا ہے۔ اس جزیرے پر پہنچنے سے پہلے اُس نے تو اپنی ساری کشتیاں نذرِ آتش کر دی ہیں۔

اب وہ واپس نہیں جا سکتا۔ گلنار اُسے پکارتی یہاں سے گئی ہو گی۔ اس کی الوداعی فریاد ان درختوں نے ضرور سُنی ہو گی۔ وہ ان درختوں کو گواہ بنا کر گئی ہو گی کہ انور آئے تو اُسے کہنا۔ گلنار تجھے یاد کر کے روتی ہوئی یہاں سے گزری تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر سوائے تیرے اور کسی کا نام نہیں تھا۔ انور کے ذہن میں بھونرے سے گونجنے لگے۔ اس نے بجھے ہوئے الاؤ کی ٹھنڈی راکھ میں اُنگلی ڈالی۔ ماتھے پر راکھ کا نشان بنایا اور درختوں کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بولا۔

"تم بھی میرے گواہ رہنا۔ میں گلنار پر
جان قربان کر دینے کی قسم کھاتا ہوں۔
میں اس کی تلاش میں نکلتا ہوں۔ میں اس
کی محبت کی خاطر اپنا گھر بار لٹا رہا ہوں۔
اگر گلنار نہیں تو یہ دونوں چیزیں میرے
کسی کام کی نہیں۔ اگر گلنار ہے تو مجھے
ان میں سے کسی ایک کی بھی ضرورت
نہیں۔"

اس کے بعد انور نے ٹیلے پر کھڑے ہو کر ایک آخری نگاہ کوہالہ وادی پر ڈالی اور جدھر سے خانہ بدوشوں کا قافلہ گیا تھا، اُسی طرف چل پڑا۔

خانہ بدوشوں کے قافلے کا سراغ لگانا میدانوں میں بڑا آسان ہوتا ہے۔ مثلاً ہر پڑاؤ پر اُن کے بجھے ہوئے الاؤ، گدھوں کے کھُروں کے نشان اور گرے پڑے چیتھڑوں سے فوراً سراغ مل جاتا ہے۔

لیکن پہاڑیوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں خانہ بدوش کبھی سیدھے راستے سے آگے نہیں بڑھتے۔ بلکہ آسان ترین اور دشوار گزار پہاڑی راستے تلاش کر کے وہاں سے گزرتے ہیں۔ وہ سیدھی جانے والی پگ ڈنڈی کو چھوڑ کر بغلی وادیوں اور جنگلوں میں سے ہو کر نیچے اُتریں گے۔ یا پہاڑ کے اُوپر چڑھیں گے۔ اس لئے انور کو گلنار کا راستہ

تلاش کرنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔

کچھ دُور تو وہ پگڈنڈی پر نشان دیکھتا ویسے ہی چلتا چلا گیا۔ لیکن کوئی دو ایک میل پیدل چلنے کے بعد ایک تو رات گہری ہو گئی۔ دوسرے پگ ڈنڈی وادی کا علاقہ چھوڑ کر ایک قریبی جنگل میں جاتی دکھائی دی۔ لیکن انور نے رُکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رات بھر اگر چلتا رہے تو کہیں جا کر وہ دوسرے ریز خانہ بدوشوں کے قافلے کے عقب میں جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ صبح کے یہاں سے چلے ہوئے تھے اور اب تک کافی دُور پہنچ کر جنگل میں پڑاؤ ڈالے آرام کر رہے ہوں گے۔ ویسے بھی پہاڑی خانہ بدوش بہت تیز تیز سفر کرتے ہیں۔

انور چلتا گیا۔

جنگل چیڑھ کا تھا اور اتنا گھنا نہیں تھا۔ درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ ڈھلان کی شکل میں اُدھر چڑھتے چلے گئے تھے۔ یہاں اگرچہ بہت اندھیرا تھا اور کہیں بھی کوئی روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم جنگلوں کی راتیں تھوڑی بہت ہلکی ہلکی روشن بھی ہوا کرتی ہیں۔ انور ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں راستہ تلاش کرتا پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ اُسے جنگلی جانوروں کا بھی خدشہ تھا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ ان جنگلوں میں جنگلی ریچھ عام پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ گلنار کی محبت میں خود ایک ریچھ بنا اپنے خیال میں مست آگے چلا جا رہا تھا۔ وہ ہر ریچھ سے مقابلے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اس کے بازوؤں میں قوت تھی، ذہن میں پہاڑ ایسا مضبوط عزم تھا اور جیب میں لمبی تیز دھار والی چھُری موجود تھی۔ کافی دُور تک چلنے کے بعد پہاڑ کی چڑھائی ایک دم ختم ہو گئی۔ اب وہ ایک بہت بڑے پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ اس کے پاؤں تھک گئے تھے اور ٹانگیں درد کرنے لگی تھیں۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ جیب میں سگرٹوں سے بھرا ہوا سگریٹ کیس موجود تھا مگر اُس کا سگریٹ پینے کو بالکل جی نہ چاہا۔

بلکہ اُسے گرمی محسوس ہو رہی تھی اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ مگر وہاں کوئی چشمہ وغیرہ نہیں تھا۔ جنگل سنسان تھا۔ چیڑھ کے درختوں میں ستمبر کے آخیر کی خزاں آلود ہوا سرسرا رہی تھی۔ جیسے اس کی محبت کے لیے پر سرگوشیاں کر رہی ہو۔ اچانک انور کو ایک جگہ درختوں کے درمیان روشنی سی ٹمٹماتی دکھائی دی۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ ذرا فاصلے پر نیچے درختوں کے جھنڈ میں ایک جگہ لیمپ جل رہا تھا۔ انور ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور اسی پگ ڈنڈی پر سے ہوتا ہوا نیچے ان درختوں کی طرف چل پڑا۔

جب وہ چیڑھ کے جھنڈ کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ پتھروں کی بنی ہوئی ایک جھونپڑی سی ہے جس کی چھت ٹین کی ہے اور بند دروازے کے باہر طاقچے میں ایک مٹی کے تیل کی کُپی جل رہی ہے۔ انور نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اُس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔

کسی نے اُٹھ کر آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ پھٹے پُرانے کپڑے پہن رکھے تھے اور کندھوں کے گرد ایک پُرانا کھیس لپٹا ہوا تھا۔

"کون ہو بھائی؟"

اُس نے پوچھا۔ انور نے کہا۔

"مسافر ہوں۔ پیاس لگی ہے۔"

"اندر آ جاؤ!"

کوٹھڑی بڑی گندی تھی۔ ایک طرف جھلنگا سی کھاٹ پڑی تھی کونے میں چولہا بنا تھا۔ دیواریں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں چولہے کے پاس ہی مٹکا پانی سے بھرا پڑا تھا۔ جس پر ٹین کا ایک ڈونگا رکھا ہوا تھا۔ اس آدمی نے انور کو چارپائی پر بیٹھنے کو کہا اور خود ٹین کے ڈونگے میں پانی ڈال کر دیا۔

انور پانی پینے لگا۔ جب پانی پی چکا تو اُس نے آدمی سے پوچھا۔

"تم کوئی شہری بابو لگتے ہو۔ آدھی رات
کو ادھر کیسے نکل آئے؟"

انور نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ میزبان کو پیش
کیا۔ میزبان نے سگریٹ لے کر سلگا لیا۔ انور بولا۔

"مسافر ہوں۔ راستہ بھول گیا تھا۔"

میزبان نے حیرت سے پوچھا۔

"مگر تم تو ٹھیک پہاڑی راستے پر چل کر ادھر آ
رہے ہو۔ یہ پگڈنڈی کوہالہ سے آتی ہے
اور کشمیر کی پہاڑیوں کی طرف نکل جاتی ہے
تم نے کہاں سے راستہ بھولا تھا؟"

انور سمجھ گیا کہ یہ پہاڑی میزبان ہوشیار آدمی ہے اور اُسے وہ اتنی آسانی سے
بے وقوف نہیں بنا سکتا۔

"بات یہ ہے کہ میں سیر کی غرض سے
ادھر نکل آیا تھا۔ جب بہت آگے
چلا آیا تو رات زیادہ ہو گئی اور واپس جانا
مناسب خیال نہ کیا۔"

میزبان نے چولہے میں آگ روشن کرتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ تم خوشی سے یہاں رات
بسر کرو۔ یہاں میرے پاس ایک ہی
بستر ہے۔ وہ تم لے لینا۔ میں چولہے کے
پاس اسی کھیس میں لپٹ کر پڑ رہوں گا۔"

"نہیں نہیں بھائی! تمہارا شکریہ! میں رات
بسر کر کے تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔ شاید

میں ابھی واپس چلا جاؤں۔"

"ابھی؟ اس وقت جنگل میں سفر کرنا
خطرے سے خالی نہیں۔ یہاں ریچھ رات
کو اکثر نکل آیا کرتے ہیں۔ جانتے ہو میں
نے یہ باہر لیمپ کیوں جلا رکھا ہے؟"

"کیوں؟"

"اس کے دو مصرف ہیں۔ پہلا تو یہ کہ
یہ لیمپ ریچھوں کو ادھر آنے سے باز
رکھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کی روشنی دیکھ
کر بھولے بھٹکے مسافر سیدھا راستہ تلاش
کر لیتے ہیں۔"

انور نے پوچھا۔

"تم یہاں کیا کرتے ہو؟"

"کچھ نہیں، صرف سوتا ہوں۔"

"اور کام کیا کرتے ہو؟"

"گرمیوں میں جب صاحب لوگ مری
آتے ہیں تو اُن کے لئے گھروں کا پانی
بھرتا ہوں۔ پورا سیزن کام کرتا ہوں اور
باقی سردیوں میں یہاں بیٹھ کر کھاتا ہوں۔
کبھی کبھی کوہالے جا کر محنت مزدوری بھی
کر لیتا ہوں۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"علیا۔"

انور خاموش ہو رہا۔ علیا نے آگ روشن کر کے اُوپر ایک دھواں کھائی سیاہ کیتلی
آگ پر رکھ دی اور خود چُولہے کے آگے بیٹھ کر ہاتھ پھیلا کر آگ تاپنے لگا۔

"ابھی یہاں سردی صرف رات کو ہوتی ہے
بابوجی! اب کے بارشیں کم ہوئی ہیں۔
سنا ہے کراچی میں بڑی بارش ہوئی ہے
کیوں بابوجی؟"

"کیا؟"

انور نے چونک کر پوچھا۔ وہ اپنے خیالات میں گم تھا۔ اور اس وقت صرف
گلنار کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کے خیال میں جانے کس وادی، کون سے
جنگل میں، وہاں سے کتنی دُور سردار شمور کے خیمے میں اس کی مارپیٹ سہنے کے
بعد گھاس پھُونس کے بستر پر لیٹی انور کو یاد کر رہی ہوگی۔

"سُنا ہے کراچی میں ۔۔۔۔"

"ہاں ہاں۔ کراچی میں بھی خانہ بدوش
ہوتے ہیں۔"

میزبان نے تعجب خیز نگاہوں سے انور کی طرف دیکھا۔

"خانہ بدوش کون بابو؟"

انور نے بات پلٹ کر پوچھا۔

"علیا! یہ تو بتاؤ یہاں سے خانہ بدوشوں
کے کسی قافلے کو تو گزرتے نہیں دیکھا؟"

"خانہ بدوش تو بابوجی ہم سبھی ہیں، ویسے
یہاں سے ایسے لوگوں کے قافلے تو گزرتے
ہی رہتے ہیں۔"

انور انگلیوں سے سگریٹ مروڑ رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے۔ تم نے ——
تم نے صبح کسی قافلے کو یہاں سے گزرتے
دیکھا ہے؟"

"صبح تو بابو میں کوہالے میں تھا۔ میں تو
شام کو آیا ہوں۔ آج راجہ صاحب نے
اپنے گھر بلایا تھا۔ اُن کی بھینس کی
کوٹھڑی کی ایک دیوار گر گئی تھی اُسے
پھر سے لیپنا تھا۔ راجہ صاحب تو بس
بیگار لیتے ہیں بیگار —— بچہ کام
کرتے جاؤ اور مانگو کچھ نہیں۔ ہی ہی ہی۔"

انور بے چین ہو کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔

"کیوں بابوجی! کہاں چلے؟ میں بستر بچھاؤں
کیا؟"

انور نے سگریٹ پاؤں تلے مسلتے ہوئے کہا۔

"نہیں علیا نہیں۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔"

علیا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"نہ بابو! اتنی اندھیری رات میں جنگل میں
مت جانا۔ بابو! یہ جنگل راتوں کو بڑا خطرناک
ہوتا ہے۔ بھیڑیئے تو عام پھرتے رہتے
ہیں اور کیا خبر ریچھ بھی مل جائے۔ رات
یہیں آرام کرو۔ صبح میں خود تمہیں واپس
چھوڑ آؤں گا۔"

انور عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ کیا وہ اس کوٹھڑی میں ٹھہر جائے۔ اس

طرح تو جب وہ صبح یہاں سے چلے گا تو خانہ بدوش اگلے پڑاؤ سے کوچ بول دیں گے اور اسی طرح ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اُسے ابھی وہاں سے چل دینا چاہیئے۔ رات بھر جنگل میں چلتے رہنے سے وہ صبح خانہ بدوشوں کو اُن کے پڑاؤ پر ہی جا لے گا۔

اچانک دروازے پر کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی۔ انور نے چونک کر دیکھا۔ علیا وہیں کا وہیں بیٹھا رہا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے انور کو بالکل خاموش رہنے کو کہا۔ کوٹھڑی میں بالکل سناٹا طاری ہوگیا۔ دروازے پر یہ کھڑکھڑاہٹ ایسی تھی جیسے کوئی اپنے پنجوں سے خراشیں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کچھ دیر دروازے پر ناخون مارنے کی آواز آتی رہی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے اپنا زبردست سر دروازے سے مارا ہو۔ پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

جب ہر طرف سکوت طاری ہوگیا تو علیا نے اُٹھ کر دروازے کی درز میں سے باہر دیکھا اور اطمینان کا سانس لے کر بولا۔

"چلا گیا سالا!"

"کون تھا؟"

انور نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ریچھ"

انور نے کہا۔

"تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ میرے پاس چھری تھی"

علیا ہنس پڑا۔

"بابو! یہ جنگلی ریچھ چھری چلانے کی مہلت ہی نہیں دیتے۔ یہ تو بس بڑے پیار سے سینے سے چمٹا لیتے ہیں اور ایک پل میں

ساری پسلیوں کا سُرمہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔"

انور نے فیصلہ کر لیا کہ وہ رات وہیں بسر کرے گا۔

رات انور نے جس طرح گزاری، وہ کچھ وہی جانتا تھا۔ جھلنگا سی چارپائی پر وہ اوورکوٹ پہن کر پڑا رہا۔ اور نیند کا خمار اُس کی آنکھوں میں ہی سلگتا رہا۔ علیا چولہے کے پاس زمین پر بے سُدھ پڑا خراٹے لیتا رہا۔ اُس کے خراٹوں نے انور کو مزید پریشان کر دیا۔ اندھیرے میں اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوٹھڑی میں اس کے پاس ہی فرش پر ایک ریچھ پڑا سو رہا ہے۔

ابھی پَو بھی اچھی طرح نہیں پھٹی تھی کہ انور نے علیا کو جگا کر کہا کہ وہ جا رہا ہے علیا نے کلمہ پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا اور دیوار پر زور سے تھوک کر بولا۔

"بابو! اتنی سویرے چل پڑے؟"

"ہاں علیا! مجھے جلدی جانا ہے"

"تو ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں نہیں تو تم پھر راستہ بھول جاؤ گے"

انور نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں علیا! تم آرام کرو۔ میں راستہ تلاش کر لوں گا"

انور نے سلام کیا اور کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ اب اُس نے تازہ دم ہو کر تیزی سے آگے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ دوپہر تک وہ سفر کرتا رہا۔ اس کا جوتا مضبوط تھا۔ وہ پھٹا تو نہ لیکن انور کے پاؤں اس کے اندر درد کرنے لگے۔ پتلون جھاڑیوں میں اُلجھ اُلجھ کر دو ایک جگہوں سے پھٹ گئی۔ لمبا کوٹ اُسے ایک بوجھ معلوم ہونے لگا۔ پیاس سے حلق خشک ہو گیا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ بال پریشان ہو کر اِدھر اُدھر اُڑنے لگے۔

جنگل ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ درختوں کا ایک ذخیرہ ختم ہوتا تھوڑا سا پتھریلا

میدان آتا اور پھر جنگل شروع ہو جاتا۔ کبھی چڑھائی آجاتی۔ اور کبھی اچانک ڈھلوان سے دو چار ہونا پڑتا۔ جس پگڈنڈی پر وہ جا رہا تھا۔ وہ کبھی جنگلی پہاڑیوں میں گم ہو جاتی اور کبھی پتھریلے میدان میں پھیل جاتی۔ یہ پتھریلے میدان خشک ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی جلی ہوئی چٹانوں سے اٹے ہوتے۔ انور نے رُکنا مناسب نہ سمجھا اور چلتا گیا۔

تیسرے پہر جبکہ سورج کی کرنیں ترچھی ہو رہی تھیں اور وہ مغربی پہاڑوں پر جھکتا جا رہا تھا۔ انور کا بھوک اور پیاس سے بُرا حال ہو گیا۔ وہ تھک ہار کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ایکا ایکی اُسے پانی کے گرنے کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

اس نے اُٹھ کر پانی کی تلاش شروع کر دی۔ آخر اُسے ایک ٹیلے کی کھوہ میں پانی مل گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا چشمہ تھا جس کا پانی پہاڑ کی ایک درز سے نکل نکل کر نیچے جوہڑ میں جمع ہو رہا تھا۔ اور وہاں سے نیچے ہی نیچے گھاٹی کی طرف بہہ رہا تھا انور نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ ہاتھ منہ دھویا اور پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ اب اُسے ایک پہاڑ کی چڑھائی درپیش تھی۔ خوب سیر ہو کر پانی پی لینے اور پھر چلنے سے اس کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ مگر وہ بالکل نہ رُکا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر وہ نیچے اُترنے لگا تو اس کے سامنے ایک بڑی دلکش وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وادی کے شروع میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں کے کچے مکان پہاڑ کی ڈھلان پر چبوترے بنا کر بنائے گئے تھے اور چھتوں پر کہیں مرچیں اور کہیں اناج کے ڈھیر سوکھ رہے تھے۔ انور گاؤں میں داخل ہو گیا۔

ایک میلی کچیلی سی چائے کی دکان پر بیٹھ کر اس نے گندی چائے پی اور ڈبل روٹی کے باسی ٹکڑے زہر مار کئے۔ یہاں سے اس نے کچھ ڈبل روٹی خرید کر جیب میں رکھ لی۔

دکاندار نے مشتبہ نگاہوں سے انور کو دیکھ کر پوچھا۔

”بابو جی! آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟“

دراصل انور کی حالت ہی کچھ ایسی تھی۔ نہ تو وہ سیاحوں کی طرح سفری سامان

سے لیس تھا اور نہ دیہاتی لوگوں ایسا لباس پہنے ہوئے تھا۔ کپڑے اس کے شہریوں ایسے تھے اور حالت اس کی انتہائی بُری ہو رہی تھی۔ جیسے جیل سے فرار ہو کر جائے پناہ ڈھونڈھ رہا ہو۔ انور نے چائے کا دوسرا گلاس پیتے ہوئے کہا۔

”یونہی ذرا دیہات کی سیر کو نکلا ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“

انور صاف سمجھ گیا کہ دکاندار نے اس کی بات پر اعتبار نہیں کیا۔ لیکن اُسے دکاندار سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ جائے جہنم میں۔ انور کو تو صرف یہی فکر لگا ہوا تھا کہ کسی طرح وہ گلنار کے قافلے کا کھوج لگا لے۔ ایک بات کا اُس کو خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ اگر خانہ بدوشوں نے ادھر کی بجائے دوسری طرف کا رُخ کر لیا ہو تو؟ پھر تو گلنار اُسے زندگی بھر کبھی نہیں مل سکتی۔ انور پریشان ہو گیا۔ اُس نے چھوٹتے ہی دکاندار سے پوچھا۔

”کیوں میاں! ادھر سے خانہ بدوشوں کا کوئی قافلہ تو نہیں گزرا؟“

”خانہ بدوشوں کا قافلہ؟“

”ہاں ہاں خانہ بدوش ــــــ جو لوگ جنگلوں میں خیمے لگا کر رات بسر کرتے ہیں۔“

دکاندار نے کہا۔

”ادھر سے تو ایسی مخلوق کبھی نہیں گزری۔“

انور بالکل نا اُمید ہو کر بیٹھ گیا۔ انور کے پاس ہی ایک آدمی دوسری طرف منہ کئے چائے کے گلاس میں مکئی کی روٹی بھگو کر کھا رہا تھا۔ اُس نے انور کا سوال اور دکاندار کا جواب سُن لیا تھا۔ دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے کہا۔

"ارے صمدو! صبح میں نے اس قسم کے لوگوں کا ایک جلوس دیکھا تھا۔"

انور نے جلدی سے پوچھا۔

"کہاں؟ کدھر؟ وہ لوگ کدھر جا رہے تھے؟"

"کھروندی گاؤں کی طرف سے آ رہے تھے اور بسیالہ خورد کی طرف جا رہے تھے۔"

انور کچھ نہ سمجھ سکا۔ دکاندار ہنس پڑا۔

"ارے بابو کو ٹھیک سے بتاؤ نا! اس بیچارے کو کھروندی اور بسیالے کی کیا خبر۔ اچھا بابو! میں تمہیں سمجھاتا ہوں قادرو کے حساب سے یہ لوگ اپنے جلوس کے ساتھ یہاں سے دو میل دریا کی طرف سے میر پور کی طرف جا رہے تھے۔"

انور ہمہ تن گوش ہو کر دکاندار کو بات کرتے سُن رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے پوچھا۔

"یہاں سے دو میل کدھر کو؟"

دکاندار نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"وہ سامنے والا ٹیلہ دیکھ رہے ہو نا، بس اس ٹیلے کے پیچھے ایک پہاڑی راستہ جاتا ہے۔ قادرو کے حساب سے

وہ قافلہ اُدھر سے گزرا ہوگا۔"

قادرو نے کہا۔

"مگر اب تو وہ میر پور سے بھی آگے نکل گئے ہوں گے۔"

دکاندار نے کہا۔

"ارے بے شرم! وہ تیز گام پر جا رہے تھے کیا؟"

قادرو بولا۔

"صمدو! یہ لوگ تیز گام ہی ہوتے ہیں مگر بابو جی! تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ تمہیں ان لوگوں سے کیا کام ہے؟"

انور نے اس سوال کا جواب تیار نہیں کیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"ان لوگوں نے میرے ایک دوست کا بچّہ اغوا کر لیا ہے، میں اس بچّے کی تلاش میں ہوں۔"

دکاندار نے انور کی حالت دیکھ کر کہا۔

"بابو! کہیں وہ تمہارا بچّہ تو نہیں تھا؟"

انور نے اُٹھ کر دکاندار کو پیسے دیتے ہوئے کہا۔

"سلام وعلیکم!"

اور گاؤں سے نکل کر اس ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ جس کے عقب میں قادرو کے بیان کے مطابق کل خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ گزرا تھا۔ جب وہ اس عقبی پہاڑی راستے پر پہنچا تو شام ہو گئی۔

۱۰

یہ پہاڑی راستہ سیدھا نیچے وادی میں چلا گیا تھا۔

یہاں سے خوبصورت اور سرسبز وادیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو رہا تھا جس کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں پہاڑوں کی اونچی دیوار چلی گئی تھی۔ یہ پہاڑ کافی فاصلے پر تھے۔ وادی میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور جنگلی جھاڑیوں سے بھری ہوئی کافی چٹانیں تھیں۔ سامنے دور ہمالیہ کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں جن پر غروب ہوتے سورج کی الوداعی کرنیں گہرے نارنجی رنگ کا سونا بکھیر رہی تھیں۔ انور کو یقین تھا کہ اگر وہ نصف رات تک اسی طرح چلتا رہا تو وہ گلمار کے قافلے کو ضرور جا لے گا۔ اس نے رات بھر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ سردی زیادہ ہو رہی تھی لیکن انور نے ہمت نہ ہاری اور اپنا سفر پھر سے شروع کر دیا۔

ادھر جب نجمہ یعنی مفرور خاوند انور کی مہجور بیوی اپنی سہیلی کے گھر سے ہو کر واپس ڈاک بنگلے پر آئی تو اسے کچھ بنگلہ ویران ویران سا معلوم ہوا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ انور کے کمرے میں گئی۔ اس کی ساری تصویریں دیواروں کے ساتھ لگی تھیں اور میز پر نجمہ کے نام کا خط پڑا تھا۔ نجمہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے لفافہ چاک کیا۔ پہلے خط اور بعد میں طلاق نامہ پڑھا اور وہیں دل تھام کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا غمگین چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نوکر نے آ کر اسے دیکھا اور حیران سا ہو کر باہر

نکل گیا۔ نجمہ کتنی ہی دیر تک روتی رہی۔ جب اس کے دل کا غبار کسی قدر چھٹا تو اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔ خط اور طلاق نامہ میز پر رکھا اور تصویروں کو اکٹھے کر کے صندوق میں بند کر دیا۔ وہ جانتی تھی انور یہ غلطی ضرور کرے گا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس گھر میں عنقریب کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے آخر وہ بات ہو کر رہی۔ نجمہ کو اس بات کا صدمہ نہیں تھا کہ انور اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے کیونکہ اس نے انور کی اس غیر ذمہ دار اور لاابالی طبیعت کو قبول کر لیا ہوا تھا۔ اسے صرف اس بات کا دکھ تھا کہ اب وہ انور کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اب وہ اس کی زندگی میں کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ساری رات وہ انور کی تصویر ہاتھ میں لے کر روتی رہی سسکیاں بھرتی رہی۔ وہ بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔

جب دن کی روشنی نمودار ہوئی تو نجمہ نے اچانک اپنے آپ کو سنبھالا۔ اسے احساس ہوا کہ انور ایک بھولا بچہ ہے جسے ایک مکار انسان انگلی سے پکڑ کر اغوا کر کے لے گیا ہے۔ انور نے ایک وقتی جذبے کے تحت ایسا کیا ہے۔ ویسے بھی ایک بار دیا ہوا طلاق شرعی طور پر جائز نہیں تھا۔ نجمہ کے دل میں عزم و ہمت اور کبھی مایوس نہ ہونے کا شعلہ بھڑکنے لگا۔ وہ ایک دم اٹھی۔ اس نے انور کے ہاتھ کا لکھا ہوا طلاق نامہ پھاڑ کر جلا دیا۔ خط میز کی دراز میں رکھا۔ منہ ہاتھ دھویا نوکر کو بلا کر کہا۔

"علی! ذرا اپنے بابا کو بلا لاؤ۔"

علی پہاڑی ملازم تھا اور اس کا بابا وہاں گھوڑوں پر بچوں کو سیر کروانے کا دھندا کیا کرتا تھا۔ رجو بابا بڑا نیک دل بوڑھا تھا اور نجمہ کے پاس ہر دوسرے روز آ کر پوچھ جایا کرتا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ جب علی کا بابا آیا تو نجمہ نے پوری بات کھول کر بتا دی۔ پہاڑی بوڑھا حیران سا ہو گیا۔

"بیٹی! تم نے انہیں روکا کیوں نہیں؟"

"میری بات وہ کب سنتے ہیں بابا۔ ! وہ

تو ہمیشہ سے من مانی کرنے کے عادی
ہیں۔"
بوڑھا سوچ میں پڑ گیا۔
"لیکن بیٹی! وہ خانہ بدوش تو اب تک
کہاں کے کہاں پہنچ گئے ہوں گے۔"
نجمہ نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا۔
"اگر وہ دنیا کے دوسرے کنارے پر بھی
پہنچ گئے ہوں تو میں پھر بھی ان کی تلاش
میں ضرور جاؤں گی بابا! اگر تم میرے ساتھ
نہیں چلو گے تو میں اکیلی ہی نکل پڑوں گی۔"
"نہیں بیٹی ایسی غلطی مت کرنا۔"
"تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں اپنے
خاوند کے لئے گھر سے نکلوں گی۔ خدا
اور اس کا رسول اس بات کے گواہ ہیں،
کہ میں اپنے بھٹکے ہوئے خاوند کو پھر سے
گھر کا راستہ دکھانے نکل رہی ہوں اگر
کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا تو نہ دے۔
خدا تو میرے ساتھ ہے۔"
بوڑھا چپ ہو رہا۔ پھر اچانک سر اٹھا کر بولا۔
"میں تیار ہوں بیگم صاحبہ!"
"سچ بابا!"
نجمہ نے خوش ہو کر کہا۔ بوڑھا بولا
"میں گھوڑوں کا انتظام کرتا ہوں۔ تم سفر کی

تیاری کرو۔ ہمیں آج ہی یہاں سے چل
دینا ہوگا۔"
نجمہ نے سارا سامان ایک کمرے میں بند کیا۔ دروازے پر تالا لگا دیا۔ اور اس کی دیکھ بھال کے لئے علی کو ہدایت کر دی کہ وہ کہیں نہ جائے اور ڈاک بنگلے پر ہی سوئے۔ علی کے بابا نے اپنے ساتھ اپنے دو جوان بیٹوں کو بھی لے لیا۔ اس کے علاوہ اس نے پانچ گھوڑے ساتھ کر لئے۔ چار گھوڑوں پر وہ خود بیٹھ گئے اور پانچویں گھوڑے پر ایک مہینے کا کھانے پینے کا سامان لاد دیا گیا۔ اور دوسرے پہر کھانے سے فارغ ہو کر یہ قافلہ میرپور کی وادیوں کی جانب روانہ ہو پڑا۔

رجو بابا ان پہاڑیوں کا بھیدی تھا۔ دوسرے اُسے اس علاقے میں ارد گرد کے دیہاتوں میں لوگ اچھی طرح جانتے تھے اور اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اُسے ان علاقوں میں لوگوں سے لین دین کرتے ایک عمر گزر گئی تھی۔ شام تک یہ قافلہ چلتا رہا۔ رات کے اوّلین لمحے بابا رجو نے ایک گاؤں میں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں بابا نجمہ کو ایک رشتہ دار عورت کے گھر لے گیا۔ ان لوگوں نے نجمہ کی بڑی خاطر داری کی۔ مکئی کی اور کرملم کا ساگ کھانے کو دیا۔ رجو بابا اپنے بیٹوں کے ساتھ ایک چائے والی کی دکان پر سو گیا۔ یہاں اتفاق سے رجو کی ملاقات اس پہاڑی سے ہو گئی جو سیزن کے دنوں مری میں لوگوں کے ہاں پانی بھرا کرتا تھا اور جس کی کوٹھڑی میں انور نے ایک بڑی ہی پریشان کن رات بسر کی تھی۔ رجو نے جب اس پہاڑی سے اپنے سفر کی نوعیت پر بات کی تو اس نے کہا۔
"وہ لمبا سا آدمی ہے نا۔ پورا کوٹ
پہنے ہوئے۔"
رجو نے کہا۔
"ہاں ہاں بالکل ایسا ہی ہے۔ تم نے
اُسے دیکھا ہے!"

"رجُو بابا! وہ تو میری کوٹھڑی میں ایک رات رہ کر گیا ہے۔ مگر وہ تو کہہ رہا تھا میں راستہ بھول کر ادھر نکل آیا ہوں۔"

"پھر وہ کدھر کو گیا تھا؟"

"پتہ نہیں، منہ اندھیرے ہی باہر جنگل میں نکل گیا تھا۔ کچھ خانہ بدوشوں کا ذکر کر رہا تھا۔"

رجُو کو تسلی ہوگئی کہ وہ غلط راستے پر نہیں چل رہا۔ خانہ بدوش ملیں یا نہ ملیں نجمہ بی بی کا خاوند ضرور مل جائے گا۔ صبح اس کا ذکر بابا نے نجمہ سے بھی کیا۔ نجمہ کے دل میں بھی اُمید کی کرن جگمگا اٹھی۔ کاش! وہ دوسرے پڑاؤ پر پہنچنے سے پہلے ہی انور کو پالے۔ اس کا دل اس گرفتار پرندے کی طرح سینے میں پھڑپھڑانے لگا جس کے پاؤں شکاری نے باندھ رکھے ہوں۔ دوسرے روز منہ اندھیرے ہی گھوڑوں پر کاٹھیاں کسی گئیں۔ گھوڑے دانہ دُنکا کھانے کے بعد تازہ دم ہو گئے تھے اور سفر کرنے کو بالکل تیار تھے۔ رجُو بابا کی قیادت میں یہ قافلہ انور بابو کی تلاش میں آگے روانہ ہوگیا۔ دوپہر کو کھانے کے لئے ان لوگوں نے جنگل میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر چل پڑے۔

شام کو یہ مختصر سا قافلہ پہاڑ کی ڈھلان اُتر کر اس وادی میں جا پہنچا جس کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک گندی سی دکان میں انور نے چائے پی تھی اور ڈبل روٹی خرید کر قادرو سے خانہ بدوشوں کا اَتہ پتہ معلوم کیا تھا۔ اس گاؤں میں بھی رجو بابا کو سب لوگ جانتے تھے۔ رجُو نے ایک ٹھیکیدار کے گھر نجمہ کو ٹھہرایا اور خود اس دکان میں آگیا جہاں کل شام انور نے چائے پی تھی۔

یہاں جب دکاندار صمدو کو معلوم ہوا کہ رجُو بابا اس نوجوان کی تلاش میں آیا ہے جو کل شام اس کی دکان میں بیٹھا تھا تو اس نے اس کا سارا حلیہ بیان کر دیا اور

یہ بھی بتا دیا کہ وہ خانہ بدوشوں کی تلاش میں بسیا سے خورد گاؤں کی طرف گیا تھا۔

"مگر رجُو بابا! وہ تو کہہ رہا تھا اس کے دوست کا بچہ خانہ بدوش اُڑا کر ساتھ لے گئے ہیں۔"

"صمدو! بس کچھ نہ پوچھو۔ عجیب زمانہ آگیا ہے۔ اتنی نیک بیوی کے ہوتے ہوئے خدا جانے اس کو شیطان نے کس طرح بہکا دیا کہ گھر بار کے سُکھ چین پر لات مار کر ایک آوارہ لڑکی کے پیچھے نکل کھڑا ہوا۔"

"تو کیا وہ نیک بی بی بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

"اور کیا — ٹھیکیدار کے ہاں اُس بے چاری کو ٹھہرایا ہے۔"

صمدو نے کہا۔

"رجو! میری مانو اس بے چاری کو ٹھیکیدار کی بیوی کے پاس ہی چھوڑ جاؤ اور خود بابو کی تلاش کرو۔ وہ بیچاری کہاں ماری ماری پھرے گی۔"

"اوّل تو بیگم صاحبہ یہاں نہیں رہے گی دوسرے تم کیا سمجھتے ہو بابو میرے کہنے سے واپس آجائے گا! ارے بھائی اُس کے سر پر تو عشق کا بھوت

سوار ہے۔ اُسے تو اب خدا ہی اتارے۔"
"اچھا رجو بابا! خدا اس بیچاری کا گھر آباد
کرے۔"

رجو بابا دوسرے روز صبح صبح جب سفر پھر شروع کرنے لگا تو نجمہ کو صمدو کی ساری بات چیت سنا دی۔ نجمہ کو ان باتوں سے بڑا حوصلہ ہوا۔ اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ اب اُسے یقین تھا کہ وہ ٹھیک راستے پر جا رہی ہے اور اس کی محنت اکارت نہیں جائے گی۔

منہ اندھیرے یہ قافلہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اُدھر انور جب شام کو پہاڑی گھاٹیوں اور اونچے نیچے پتھریلے راستوں سے نکل کر وادی میں داخل ہوا تو راستے میں ہی اُسے رات ہو گئی۔ وہ بسیالہ گاؤں سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ اور یہاں سے جنوب مشرق کی طرف میر پور کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ اُسے کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کن علاقوں میں سفر کر رہا ہے۔ اُس پر تو ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح وہ گلنار کو پا لے۔ اس کے لئے خواہ اُسے دریا عبور کرنے پڑیں۔ سمندروں کی موجوں سے نبرد آزما ہونا پڑے اور خواہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے گزرنا پڑے۔ وادی کے بیچ میں سے ہو کر جاتی ہوئی یہ چھوٹی سی کچی پگڈنڈی دور تک چلی جا رہی تھی۔ اس لئے انور نے کہیں رُکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کافی دور نکل گیا مگر خانہ بدوشوں کا کہیں نشان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو زمین نگل گئی کہ آسمان کھا گیا۔ کیا وہ کہیں پڑاؤ کئے بغیر ہی چلے جا رہے ہیں! یقیناً ایسی ہی بات تھی۔ ورنہ اس وقت تک انور کو ان کے قرب و جوار میں پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ وہ ساری رات انور وادی میں چلتا رہا۔ پچھلے پہر اُس نے ایک پرانے سے اُجڑے ہوئے کھنڈر میں تھوڑی دیر آرام کیا۔ دن چڑھے اُٹھا۔ چشمے پر منہ ہاتھ دھویا۔ جیب سے ڈبل نکال کر کھائی۔ چشمے کا پانی پیا اور پھر چل پڑا۔ سارا دن وہ پھر سفر کرتا رہا۔ شام کو اس کی ہمت جواب دے گئی اس کا جوتا

پھٹ چکا تھا۔ اُنگلیوں پر ورم آگیا تھا۔ ٹانگیں لکڑی کی طرح سخت ہو رہی تھیں۔ پتلون جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس وقت وہ حیرت انگیز مناظر قدرت کی سر زمین میں پہنچ گیا تھا۔ یہاں چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے اور درمیان میں ہری بھری چراگاہیں مسکرا رہی تھیں۔ انور ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہو گیا۔ اس بستی میں ایک نیک دل آدمی نے اُسے اپنے گھر رات کاٹنے کو جگہ دے دی۔ انور کی حالت ایسی تھی کہ اُسے ہر آدمی شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ انور کا دل بجھ سا گیا تھا۔ اس کا من کئی بار چاہا کہ وہ خودکشی کر لے اور اس در بدر کی نامراد زندگی سے نجات حاصل کر لے مگر جانے کس بات کی لگن تھی کہ وہ زندگی کو بچا بچا کر رکھ رہا تھا۔ اس کسمپرسی کے عالم میں بھی وہ بھی اسے سنبھال سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ رات جلد ہی وہ سو گیا۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ کھلی تو مکان کے روشندان میں سے ستارے جھلملاتے نظر آ رہے تھے۔

انور کو وہ رات یاد آ گئی جس رات اُس نے پہلی بار ستاروں کی روشنی میں گلنار کا منہ چوما تھا۔ وہ بے اختیار ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اوور کوٹ پہنا۔ پھٹے ہوئے جوتے پہنے اور چپکے مکان سے باہر نکل آیا۔ باہر سرد ہوا چل رہی تھی۔ ابھی ایک پہر رات باقی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول کھلے ہوئے تھے۔ انور نے گاؤں کو الوداع کہا اور آگے چلنا شروع کر دیا۔

ابھی وہ جنگل میں بمشکل ایک میل ہی چلا ہو گا کہ اچانک اُسے اکتارے کی آواز سنائی دی۔ اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اکتارے کی آواز کہیں قریب ہی سے آ رہی تھی۔ اس کے ارد گرد چیڑ کے بے شمار درخت تھے۔ بائیں طرف ایک گہری گھاٹی تھی، اور دائیں جانب ایک بہت بڑی چٹان کا کونہ سڑک پر آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اب اکتارے کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔ پہلے ایسے لگتا تھا جیسے کوئی اکتارہ درست کر رہا ہے۔ اور اب وہ اُسے باقاعدہ بجانے لگا تھا۔ یہ وہی خانہ بدوشوں والا اکتارہ تھا۔ انور دیوانوں کی طرح اس آواز کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے

آج گوہرِ امید مل گیا تھا اُسے اپنی ساری تھکان بھول گئی تھی۔ اس کے پاؤں سوجے ہوئے تھے لیکن اب اُسے پھول کی طرح ہلکے پھلکے محسوس ہو رہے تھے۔

اُس نے چٹان کا موڑ گھوم کر دیکھا کہ پہاڑی کی ڈھلان شروع ہو گئی ہے اور چیڑ کے درختوں کا سلسلہ دوسری وادی تک چلا گیا ہے۔ یہ آواز نیچے وادی کی طرف سے آ رہی تھی۔ انور جلدی جلدی ڈھلان اُترنے لگا۔ جب وہ نیچے وادی میں پہنچا تو اکتارے کی آواز بند ہو گئی۔ وہ ایک درخت کی اوٹ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یُوں لگا جیسے کسی نے اُسے دیکھ کر اکتارہ بجانا بند کر دیا ہے۔ اب جنگل میں پھر وہی مخصوص خاموشی طاری ہو گئی جس سے انور کافی حد تک مانوس ہو گیا تھا اور جواب اس کے لئے خاموشی نہیں رہی تھی وہ اس خاموشی میں ہلکی سے ہلکی آہٹ بھی سُن سکتا تھا۔ اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ایک طرف کو نکل گیا ہے۔ انور نے فوراً ایک طرف گردن گھمائی اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اُسے دُور درختوں میں ایک سایہ سا بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ انور نے پوری قوت سے اس سائے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

جانے وہ کونسی پُراسرار طاقت تھی جس نے اُسے سائے کے تعاقب میں لگا دیا تھا۔ حالانکہ انور کو بالکل علم نہیں تھا کہ وہ انسان کون ہے۔ پھر بھی وہ بھاگے چلا جا رہا تھا۔ اب وہ اس سائے کے وجود کو صاف دیکھ رہا تھا۔ یہ وجود ایک عورت کا تھا جس کی گھگری ہوا میں اُڑ رہی تھی اور بال لہرا رہے تھے۔ انور نے ایک ہی جست میں سائے کو دبوچ لیا۔

"گلنار"

ماتھے پر کھلے سیاہ بالوں کی لٹ، دم پھولا ہوا۔ آنکھیں اسی طرح پُراسرار اور سحر کار۔ چہرے پر گہری خاموشی اور اذیت کا احساس ——— یہ گلنار تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں اکتارہ تھا اور دوسرا ہاتھ انور نے تھام رکھا تھا۔ گلنار بھی انور کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ انور کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ پھٹا ہوا لباس۔ پھٹے ہوئے جوتے۔ بکھرے

ہوئے بال۔ چہرہ پریشان۔ بڑھی ہوئی داڑھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں کا سانس پھولا ہوا تھا۔ دونوں پریشان تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پا کر خوش تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ انور نے پاگلوں کی طرح گلنار کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

"گلنار ——— ! گلنار ——— !!

میں ......"

انور اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور بے ہوش سا ہو کر گر پڑا۔ جب اُسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا، گلنار کا خوبصورت مسکراتا ہوا چہرہ اس پر جُھکا ہوا تھا اس کے بالوں کی ایک لٹ آگے کو پھسل کر انور کے ہونٹوں کو چھُو رہی تھی۔ گلنار کے چہرے کے اُوپر چیڑھ کے درختوں میں سے آسمان دکھائی دے رہا تھا جس پر پچھلی رات کے ستارے تیزی سے ٹمٹما رہے تھے۔

گلنار نے بڑی محبت سے انور کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم نے میرے لئے اتنی تکلیف
کیوں اُٹھائی ؟"
"اِس لئے کہ میں تمہارے بغیر زندہ
نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے کہ تمہارے
بغیر میری زندگی کا چراغ جھلملانے لگتا
تھا۔ اس لئے کہ میں تم سے محبت
کرتا ہوں۔ تمہارے پاس رہنا چاہتا
ہوں۔ تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، ہر دَور کے لئے

ہر جنم کے لئے۔"
گلنار نے اپنے ہونٹ انور کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ انور کو یوں لگا جیسے
آسمان پر سے چاند اتر کر چیڑھ کے جھومروں میں سے ہوتا ہوا اس کی جھولی میں
آن گرا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور دونوں ہاتھ گلنار کی گردن میں حمائل
کر دیئے۔ کتنی ہی دیر دونوں عاشق ایک دوسرے سے کوئی بات کئے بغیر
ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے۔ گلنار نے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"لیکن بابو! اب کیا کرو گے؟ تم ہمارے
ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم نے آج ہی یہاں
پڑاؤ ڈالا ہے اور کل صبح یہاں سے کوچ
کر جائیں گے۔"

انور نے کہا۔

"اس کے بعد کیا ہوا تھا گلنار؟ مجھے
بتاؤ پھر تم پر کیا گزری؟"

گلنار مسکرائی۔ اندھیرے میں اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔

"پھر سردار نے مجھے خیمے میں آکر ہنٹر سے
بڑا مارا۔ میں نے کہا۔ تم مجھے چاہے جان
سے مار دو مگر بابو کی محبت میرے دل سے
نہیں ......"

گلنار شرما گئی۔ انور نے جلدی سے اس کا چہرہ اوپر اٹھا لیا۔

"رکو نہیں گلنار! بتاؤ پھر تم نے کیا کہا؟
کیا کہا تھا تم نے؟ یہی کہ بابو کی محبت
میرے دل ......"

گلنار نے شرماتے ہوئے کہا۔

"میرے دل سے کبھی نہیں نکال سکتے۔
سردار اس پر طیش میں آگیا۔ اس نے
مجھے خیمے میں بند کر دیا اور حکم دے دیا کہ
ابھی کوچ کیا جائے۔ اسی وقت سامان
باندھا گیا۔ گدھے تیار کئے گئے اور ہمارا
قافلہ چل پڑا۔ سردار کو تمہارا اتنا خیال تھا
کہ تم آنہ جاؤ وہ دو دن اور دو راتیں متواتر
قافلے کو بھگائے لئے پھرا۔ صرف ایک
دو جگہ چند لمحوں کے لئے ہم رکے ہوں
گے۔"

انور نے گلنار کے رخساروں کو چوم کر کہا۔

"تم نے بھی مجھے یاد کیا تھا؟"

"میں نے؟"

"ہاں ہاں تم نے۔"

"نہیں۔"

اتنا کہہ کر گلنار بھاگ گئی۔ انور نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا۔

"گلنار! ایک بات سنو!"

"کیا؟"

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

گلنار خاموش ہو گئی۔

"خاموش کیوں ہو گئی ہو؟"

گلنار نے گہری نگاہ انور پر ڈالی اور بولی۔

"میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی بابو!

میں بھی تم سے اسی طرح محبت کرتی ہوں
لیکن میں تمہیں ایسا کہتے ہوئے ڈرتی ہوں
اس لئے کہ محبت بڑی خطرناک شے ہے
میں جانتی ہوں۔ ایک دن تم بھی مجھے
چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔"

"وہ کیسے؟"

"جس طرح تم نے اپنی بیوی کو میرے
لئے چھوڑ دیا ہے۔"

انور کو ایک دھکا سا لگا۔ حقیقت میں اس کے پاس گلنار کی اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ ایسا آدمی کسی دوسری زیادہ خوبصورت عورت کے مل جانے پر گلنار کو بڑی آسانی سے چھوڑ سکتا تھا۔ پھر بھی انور کو یوں لگ رہا تھا جیسے گلنار اس کی پہلی اور آخری عورت ہے۔ جیسے اس کے بعد وہ کسی عورت سے پیار نہ کر سکے گا۔ اس نے گلنار کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا گلنار! میں تمہیں
چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔ میں اس جنگل
کی قسم کھاتا ہوں کہ مجھے تم سے صرف
موت ہی جدا کرے گی۔"

"کیا تم سچ مچ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے
ہو؟"

"اس سے بھی زیادہ گلنار! میں اپنی محبت
کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ تم سمندر کے ذروں
کو شمار کر سکتی ہو مگر میری محبت کا اندازہ
نہیں لگا سکتیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ سورج
دن کی بجائے رات کو طلوع ہو۔ ستارے
بادلوں کے اوپر نکل کر مسکرائیں۔ ہوا چلے
اور ایک بھی پتا اپنی جگہ سے نہ ہلے
بہار آئے اور درختوں پر ایک بھی پھول
نہ کھلے خزاں آئے اور ڈالیوں پر ایک
بھی پھول نہ مرجھائے۔ لیکن ایسا کبھی
نہیں ہو سکتا کہ انور گلنار سے محبت کرنا
چھوڑ دے۔ ایسا ہرگز ہرگز کبھی نہیں ہو
سکتا۔"

گلنار اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ انور بھی کھڑا ہو گیا۔ گلنار کے چہرے پر ایک پُر جلال چمک آ گئی تھی۔ اُس نے انور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک مرد کا قول ہے؟"

"مرد کا بھی اور ایک سچے عاشق کا بھی۔"

"تو میرا ہاتھ تھام لو۔ آج سے میں تیری
ہوں اور تیرے ساتھ ہی رہوں گی۔ مجھے
جہاں چاہے لے جاؤ۔"

انور بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ چاہتا وہ بھی یہی تھا مگر یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہو جائے گا، اس کا اُسے کبھی وہم بھی نہیں تھا۔ اس کی حالت بالکل اس آدمی کی سی تھی جس نے بیماری سے شفا کی دعا مانگی ہو اور قدرت نے اُسے صحت کے ساتھ ساتھ دولت کے انبار بھی عطا کر دیئے ہوں۔ انور نے گلنار کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ ہمیشہ میری ہو کر
رہو گی؟"

گلنار کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے انور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم نے شہر والوں کی محبتیں دیکھی ہیں بابو!
اب ایک جنگلی عورت کا پیار بھی دیکھنا۔"

"تو پھر چلو۔"

"چلو۔"

گلنار نے اتنا کہا اور انور کے ساتھ ہولی۔ دونوں محبوب وہاں سے ہٹ کر ایک طرف کو نکل گئے۔ گلنار انور کو خانہ بدوشوں کے پڑاؤ سے بچا کر دوسری طرف لے کر نکل گئی۔ وادی میں جاتے کی بجائے انہوں نے شمال مغرب کی طرف ایک گہری گھاٹی میں اترنا شروع کر دیا۔

۱۱

جنگل میں صبح ہو گئی۔

چیڑ کے درختوں پر خوش الحان پرندوں نے سورج کے استقبال میں گیت گانے شروع کر دیئے۔ جنگل کی ہر شے بیدار ہو گئی۔ خانہ بدوش بھی اپنے اپنے خیموں سے باہر آ گئے۔ اور مختلف کاموں میں لگ گئے۔ ایکا ایکی سردار شمور کے ہنٹر کا پٹاخہ فضا میں گونجا۔ سب لوگ متوجہ ہو گئے۔

"گلنار کہاں ہے؟"

گلنار کہاں ہے؟ گلنار کہاں ہے؟ ایک ساتھ سارا جنگل پکار اٹھا۔ چاروں طرف ایک ہاہاکار مچ گئی۔ لیکن گلنار وہاں ہوتی تو کوئی جواب دیتا۔ گلنار اس وقت اپنے محبوب کے ساتھ تیز رفتار جھاگ اڑاتے دریا کو عبور کر کے مغربی سلسلہ ہائے کوہ کی جانب بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سردار شمور کو چھوڑ دیا تھا۔ خانہ بدوشوں کی زندگی کو چھوڑ کر ایک دوسری قسم کی خانہ بدوشی اختیار کر لی تھی۔ سردار شمور آگ بگولا ہو کر چاروں طرف چیخ چیخ کر گلنار کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے غصے میں کئی خانہ بدوش بوڑھوں اور عورتوں کو پیٹ ڈالا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ دانت چبا چبا کر تھوکے جا رہا تھا۔ اس کی درندگی اور وحشت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ اس کا ریچھ ایسا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس نے فوراً کوچ کا حکم دے دیا۔

"گلنار کی تلاش میں نکل چلو۔ اگر رات تک

گلنار نہ ملی تو میں سب کو قتل کر دوں گا۔"

سارے خانہ بدوں کی جان پر بن آئی تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ گلنار کہاں چلی گئی ہے۔ مگر انہیں اتنا ضرور معلوم تھا کہ اگر گلنار نہ ملی تو ان کی خیر نہیں ہے۔ سردار شمور نے کوئی نصف گھنٹے تک اپنے خیمے میں سب سے بوڑھے خانہ بدوش اور اپنے صلاح کار سے مشورہ کیا اور قافلے کو لے کر جنوب کی بجائے شمال مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے بھی وہی راستہ اختیار کیا جس راستے پر انور اور گلنار جا رہے تھے اور پیچھے بہت پیچھے جس راستے پر انور کی وفا شعار بیوی نجمہ گھوڑے پر سوار شکستہ دل لئے رجو بابا اور اس دو بیٹوں کے ساتھ اپنے خاوند کی تلاش میں چلی آ رہی تھی۔

نجمہ کو ہر گاؤں سے انور کی کوئی نہ کوئی خبر ملتی تھی۔ لیکن انور کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اُدھر انور اور گلنار سارا دن جنگلوں، میدانوں، وادیوں اور پہاڑیوں کے درمیان چلتے رہے۔ رات کو انہوں نے کچھ وقت کے لئے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور پھر آگے کو روانہ ہو گئے۔ انور اگرچہ بے حد تھک گیا تھا۔ مگر گلنار کے ساتھ اس میں ایک نئی زندگی آ گئی تھی۔ گلنار اس قسم کے سفر کی عادی تھی اور ایسی حالت میں تو وہ اُڑتی ہوئی جا رہی تھی۔ جبکہ اس کا محبوب اس کے ساتھ تھا۔ پھر بھی سارا دن اور ساری رات پتھریلے راستوں پر پیدل اور تیز تیز چلنے کے بعد وہ بہت تھک گئے۔ لیکن سوائے چلتے رہنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ سردار شمور ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ گلنار زیادہ متوحش تھی۔ اس لیے کہ وہ سردار شمور کی خوفناک سازشوں اور اس کی کمینہ ذہنیت اور منتقمانہ مزاج سے پوری طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سردار کبھی ان کا تعاقب نہیں چھوڑے گا۔

"پھر ہمارا ایک ہی سمت کو کوچ کرتے جانا بے فائدہ ہے گلنار!"

انور نے ایک چشمے پر گلنار کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔ اگر واپس چلیں تو راستے میں سردار کھڑا ملے گا۔"

"اور اگر ہم بائیں طرف کو گھوم جائیں۔"

"ہم ان پہاڑیوں کو کبھی عبور نہیں کر سکتے بابو بابو! یہ پہاڑ بالکل سیدھے ہیں اور پھر اوپر جا کر ان کے پتھر بھر بھرے ہوتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم آج نہیں تو کل سردار کے نرغے میں پھنس جائیں گے۔"

گلنار کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اچانک بولی۔

"ایک طریقہ ہے۔"

"کونسا؟"

"اگر ہم کسی طرح سامنے والا پہاڑ عبور کر لیں تو اس کے پہلو میں ایک دریا بہتا ہے۔ وہ دریا آگے جا کر ایک بڑی ہی دلکش لیکن انتہائی دشوار گزار تنگ وادی میں داخل ہو جاتا ہے یہ وادی بڑے بڑے پتھروں، ٹیلوں اور غاروں سے اٹی ہوئی ہے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ وہاں آج تک کوئی خانہ بدوش قافلہ نہیں گیا۔"

انور نے خوش ہو کر کہا۔

"تو پھر سوچ کیا رہی ہو۔ چلو پہاڑ پر چڑھنا شروع کرتے ہیں۔"

"اس پہاڑ پر چڑھنا انتہائی مشکل ہے بابو! رسوں کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔"

"تم میرے ساتھ آؤ۔ ہم کوشش ضرور کریں گے۔"

گلنار انور کے ساتھ چل پڑی۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر انور نے محسوس کیا کہ چڑھائی دشوار ہے۔ پھر بھی اس نے خدا کا نام لے کر گلنار کو ساتھ لیا۔ اپنا مفلر کمر کے گرد باندھ کر اس کا دوسرا سرا گلنار کی کمر کے گرد لپیٹا اور جھاڑیوں اگر سے بڑے درختوں کی باہر نکلی ہوئی کھونٹیوں کو پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دور تک اوپر چڑھنے کے بعد پہاڑ کی چڑھائی کچھ ڈھلانی ہو گئی یہاں وہ جلدی جلدی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے چڑھنے لگے۔ دونوں کی پنڈلیوں اور پاؤں میں خراشیں آ گئی تھی۔ لیکن دونوں کے حوصلے بلند تھے۔ دونوں کے دل شاداب اور ایک مساوی روشنی سے منور تھے۔ پہاڑ کی چڑھائی پھر دشوار گزار ہو گئی۔ ایک مرحلے پر گلنار کا پاؤں ایک جگہ سے پھسل گیا۔ انور نے بڑی مشکل سے اُسے قابو کیا اور اوپر کھینچا۔

بہزار وقت انہوں نے پہاڑ کی مشکل ترین چڑھائی کو آخر طے کر لیا۔ گلنار کے کہنے کے مطابق انور نے پہاڑ کی چوٹی پر سے دوسری طرف ایک دریا کو دیکھا جو گہری گھاٹیوں میں سانپ کی طرح بل کھاتا بہہ رہا تھا۔ دوسری طرف ایک نئی دنیا آباد تھی۔

ایک انتہائی خوبصورت چھوٹا سا سلسلہ ہائے کوہ مغرب سے مشرق تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ پہاڑوں پر گنجان جنگل اُگے ہوئے تھے۔ یہ پُر فضا مقام ہر اعتبار سے انتہائی دلکش تھا۔ انور اور گلنار نے جلدی جلدی دوسری طرف اترنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے دریا کی گھاٹیوں کو ایک طرف چھوڑ کر دوسری طرف سے اترنا شروع کیا تھا۔ وہ بہت جلد دوسری طرف سے ہی سرسبز اور ہرے بھرے میدان میں پہنچ گئے۔ جہاں جنگلی خودرو درختوں کی بھرمار تھی۔ یہ میدان عبور کر کے انہیں ایک چھوٹی سی چراگاہ ملی۔ یہاں کچھ مویشی ادھر ادھر چر رہے تھے۔ اور ذرا دور ایک ٹیلے کی آغوش میں مٹی کے چند ایک گھروندے بنے ہوئے تھے۔

گلنار نے کہا۔

"یہاں سے دس میل کی طرف کافرستان ہے۔"

"کیا اُدھر کو چلیں؟"

"نہیں ــــ اُدھر ہمارے پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ ہم دریا عبور کریں گے۔"

لیکن دریا کا پاٹ ہر جگہ چوڑا تھا۔ اگرچہ اتنا چوڑا بھی نہیں تھا۔ مگر وہ اُس کو پُل کے بغیر عبور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب انہوں نے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں دریا کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ کافی دور جا کر دریا بائیں جانب مڑ گیا اور انہیں دریا میں بے شمار بڑے بڑے پتھر نظر آئے۔ دریا کا پانی پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ انور نے گلنار کا ہاتھ تھام اور ان پتھروں پر چل کر دریا عبور کرنا شروع کر دیا۔ دریا کا پانی اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا کہ ایک دفعہ تو انور کا دماغ چکرا گیا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور گلنار کو ساتھ لے کر پتھروں پر سے گزر گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہاں بڑی بڑی چٹانیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ ان چٹانوں کے پتھر بے رنگ بھورے اور سیاہ تھے چٹانوں پر سبزہ نام کو بھی نہ اُگا ہوا تھا۔ صرف ان کے دامن میں خودرو جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس پتھروں اور درختوں سے اَٹی ہوئی وادی میں انور اور گلنار نے تھوڑی دیر دم لیا۔ درختوں سے کچے پکے پھل توڑ کر کھائے۔ دریا کا پانی پیا اور پھر آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔

پورا ایک دن اور ایک رات انہوں نے پھر سفر میں گزار دی۔ راستے میں انہیں ایک چھوٹا سا گاؤں ملا۔ یہ گاؤں چند ایک پتھریلے گھروں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ مویشی پال کر گزارا اوقات کرتے تھے۔ آدمیوں نے جسم کے گرد سیاہ موٹے رسے لپیٹے ہوئے تھے۔ اور عورتوں کے بال سن کی رسیوں کی طرح بٹے ہوئے تھے۔ ان کے رنگ بڑے صاف تھے۔ اور وہ مردوں سے زیادہ صحت مند معلوم ہوتی تھیں۔ رات دونوں نے ایک گھر میں بسر کی۔ یہاں انہوں نے باجرے کی روٹی اور مکھن کھایا۔ کچھ روٹیاں ساتھ لیں اور دوسرے

روزانہ صبح پھر آگے چل پڑے۔

انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک ایسے سفر پر روانہ ہیں جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ مگر ایک مقام پر پہنچکر انہیں یوں لگا جیسے وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

یہ مقام ایک چھوٹی سی وادی تھی جو ایک انتہائی شفاف چھوٹی سی جھیل کے کنارے واقع تھی۔ اس وادی میں چھوٹے چھوٹے بیشمار ٹیلے تھے جن کی ڈھلانوں پر ہری ہری گھاس اگی ہوئی تھی۔ گلنار نے جیسا کہا تھا اس جگہ پہاڑوں اور ٹیلوں کی آغوش میں کئی ایک غار بھی تھے۔ ان غاروں میں پہاڑ کے پتھروں میں سے پانی رستا رہتا ہے۔ غاروں کی فضا مرطوب اور اندھیری تھی۔ جو بات سب سے زیادہ حوصلہ افزا تھی وہ یہ تھی کہ یہاں سیب اور ناشپاتیوں کے چند ایک درخت بھی تھے جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ جس کے باسی بھیڑ بکریاں پال کر اور ان کی اون بیچ کر گزارا کرتے تھے۔

انور اور گلنار نے یہاں ایک غار کو رہائش کے لئے منتخب کیا۔ اور یہاں رہنا شروع کر دیا۔ ان کا یہ اندازِ زندگی بالکل قبل از تاریخ ایسا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ درختوں کی چھال کا لباس نہیں پہنتے تھے۔ بلکہ انہوں نے جھیل پار جا کر کچھ کپڑے خرید لیے تھے۔ انور کی جیب میں ابھی تک کوئی دو صد کے قریب روپے باقی تھے۔ اور یہ روپے ایسی جگہ پر کئی ماہ رہنے کے لئے کافی تھے۔

وہ پھل کھاتے، جھیل کا پانی پیتے اور غار میں سو رہتے۔ انہوں نے مل کر غار کو اچھی طرح صاف کر دیا تھا۔ ایک جگہ پھونس کا بستر بنا لیا تھا۔ ایسا ہی ایک بستر انور نے گلنار کے لئے بھی تیار کر لیا تھا۔ انہوں نے غار کا منہ بند کرنے کے لئے ایک خاردار دروازہ بنا لیا۔ یہ دروازہ رات کو غار کے منہ کے آگے کر دیا جاتا۔ غار کے اندر بنولے کے تیل کا دیا جلایا جاتا۔ انور نے یہ تمام چیزیں جھیل کے پار والے گاؤں سے حاصل کی تھیں۔ پانی کا مٹکا مٹی کے پیالے، تھالیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، ابھی انہوں نے پکانا شروع نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وادی میں پھلوں کی بہتات تھی۔ جس روز وہ اس وادی میں پہنچے تو انہوں نے رات غار کے اندر ویسے ہی بسر کی۔

انور نے ننگے پتھروں پر باہر سے گھاس پھونس لا کر ڈال دیا۔ اور اس کے اوپر اپنا اوور کوٹ بچھا دیا۔ رات کو جب انہیں سردی محسوس ہوئی تو انور نے اپنا اوورکوٹ نیچے سے نکال کر گلنار کے اوپر ڈال دیا اور خود آگ جلا کر اس کے پاس ہی لیٹ گیا۔ شروع رات وہ بستر پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے اور ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کرتے رہے۔

انور کے لیے یہ ایک عجیب اور تعجب خیز تجربہ تھا مگر گلنار کو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نظر نہ آئی تھی۔ چونکہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے اور ایک دوسرے کے شیدائی تھے۔ اس لئے وہ بڑے مزے سے اور ہنسی خوشی ہر تکلیف کو برداشت کر رہے تھے۔ دوسرے ہی روز انور جھیل پار والے گاؤں سے دو بکریاں خرید لایا۔ بکریوں کے آنے سے وہاں گھر ایسا ماحول پیدا ہو گیا۔ وہ دن بھر وادی کی چراگاہ میں جھاڑیوں کے پتے کھایا کرتیں۔ گلنار صبح کو ان کا دودھ دوہتی اور دونوں اُسے پی جاتے۔

گلنار ابھی تک رات کو غار میں آڑ کر کے الگ بستر پر سوتی تھی۔ کیونکہ ان دونوں میں ابھی تک میاں بیوی ایسی بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انور کو وہی پھر مشکل درپیش تھی۔ یعنی یہاں بھی سماج کا وہی فرسودہ قانون اس کی راہ میں حائل ہو رہا تھا یعنی شادی یا شادی کا انور کو پہلے ہی بڑا تلخ تجربہ تھا۔ لیکن گلنار ایک عورت تھی۔ مشرقی عورت! وہ انور سے پہلے شادی کرنا چاہتی تھی۔

انور کچھ دن خاموش رہا۔ ایک روز جبکہ گلنار انور کے کپڑوں میں پیوند لگا رہی تھی۔ انور اس کے پاس ہی آگ جلائے بیٹھا بکری کا دودھ مٹی کے پیالے میں ڈالے گرم کر رہا تھا۔ گلنار نے بڑے غور سے انور کو دیکھا۔ اس کی داڑھی باقاعدہ بڑھی ہوئی تھی۔ سر کے بال بھی کافی بڑھ آئے تھے۔

گلنار نے کہا۔

”کیا گاؤں میں کوئی حجام نہیں ہے!“

”ہے!“

”تو پھر تم بال کیوں نہیں کٹواتے! پہلے تو

تمہارے بال کٹے ہوئے ہوتے تھے۔ اور
داڑھی بھی نہیں ہوتی تھی۔"

الور نے گلنار کو بڑے غور سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے مگر اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

گلنار نے شرماتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا۔ الور اُٹھ کر اس کے پاس آن بیٹھا
الور نے گلنار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"آخر تم مجھ سے اتنی دُور کیوں ہو گلنار! کیا
میں تمہارا نہیں ہوں! کیا تم ابھی تک مجھے
غیر سمجھتی ہو! کیا ہمارے درمیان ابھی۔
تک کوئی دیوار موجود ہونی چاہیئے! ہم نے
ایک دوسرے کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دیا
پھر ہم ایک دوسرے سے اتنے دور کیوں
رہیں!"

گلنار الور کی پتلون کی گھٹنوں پر مرمت کر رہی تھی۔ الور نے اس کے ہاتھ سے پتلون
لے کر پرے رکھ دی۔ غار کے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ غار کا دروازہ بند تھا اور اس کے
اوپر ایک پرانا نمدہ ڈال دیا گیا تھا۔ الاؤ پر دودھ کا برتن رکھا ہوا تھا۔ گلنار نے الور کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر ایک ہلکی سی سرد آہ بھری اور نگاہیں جھکا لیں۔ الور نے اس کا چہرہ اوپر
اُٹھایا۔

"تم اُداس کیوں ہو گلنار! کیا تمہیں اپنے کیئے
پر پچھتاوا ہو رہا ہے؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ تم
نے میرے یہاں آکر اپنی خانہ بدوشی کی
زندگی کو چھوڑ کر کوئی غلطی کی ہے! اگر ایسی
بات ہے تو مجھے صاف صاف بتا دو۔

گلنار! میں تمہیں خود سردار شمور کے پاس
چھوڑ آؤں گا۔"

گلنار نے الور کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"اس ظالم کا پھر نام نہ لینا۔ میں کبھی اپنے کیئے
پر نادم نہیں ہوئی۔ میں اپنی خوشی سے تمہارے
ساتھ ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"پھر تم نے آہ کیوں بھری تھی؟"

"اس لئے کہ تم نے مجھے وہ مقام نہیں دیا جو
تم نے اپنی بیوی کو دے رکھا تھا۔"

الور نے گلنار کا ماتھا چوم کر کہا۔

"لیکن گلنار! میں نے تو اپنی بیوی کو چھوڑ دیا
تھا۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں بھی ایک
دن چھوڑ دوں!"

گلنار نے بڑے اعتماد سے گردن اُٹھا کر کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھے نہیں چھوڑو گے۔"

"پھر شادی کی کیا ضرورت ہے؟"

گلنار نے سر جھکا کر کہا۔

"شائد تم نہیں جانتے۔ میں پیدائشی خانہ
بدوش نہیں ہوں۔ میں چھوٹی سی تھی کہ
سردار شمور کے ہاتھ میرے چچا نے فروخت
کر دیا تھا۔"

الور نے تعجب سے پوچھا۔

"اور تمہارے ماں باپ!"

"وہ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ ہم لوگ بڑے
غریب تھے۔ چچا کے پاس کھانے کو کچھ نہیں
ہوتا تھا۔ وہ سال کے گیارہ مہینے شہروں
میں مزدوری کرتا تھا۔ پھر بھی وہ بے حد
غریب تھا۔ اور کھانے کے لئے اُس کے
پاس بہت کم ہوا کرتا تھا۔ اُس نے ان
لوگوں کے پاس مجھے فروخت کر دیا۔ اور
میں خانہ بدوش بن گئی۔ جب میں جوان
ہوئی تو میرے پاؤں میں گھنگھرو تھے۔ اور
میں لوگوں کے مجمع کے درمیان رقص کر
رہی تھی۔ سردار تیمور نے میری بدولت بڑے
عیش کئے ہیں۔ لیکن میری روح کو ہر جگہ
گدھوں کی طرح نوچا گیا ہے۔ میری بھی خواہش
تھی کہ میرا ایک گھر ہو۔ ایک چھوٹا سا گھر جس
کے آنگن میں میری ایک بھینس ہو۔ پھر اُسی
گھر میں میرے بچے ہوں جن کے لئے میں
روٹی پکاؤں۔ انہیں دودھ پلاؤں اور
اور جب میرا خاوند میرے بچوں کا باپ
کھیتوں میں کام کر کے واپس گھر آئے تو
میں اُسے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو جاؤں"

گلنار خاموش ہو گئی۔ انور نے آہستہ سے کہا۔

"پھر؟"

"پھر میرا یہ خواب خواب ہی رہا۔ کافی دیر

تک خواب ہی رہا کہ ایک دن میں نے تمہیں
دیکھا۔ تم دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھے
میرا ناچ دیکھ رہے تھے۔ ناچتے ناچتے میرے
جسم میں ایک لرزش سی ہوئی۔ ایک کپکپی
سی طاری ہوئی اور مجھے یوں لگا جیسے میرا
مالک میرے بچوں کا باپ، کھیتوں سے کام
کر کے تھکا ماندہ گھر آ گیا ہے۔"

گلنار پھر خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"میں نے جان بوجھ کر اپنی کلائی کا ایک پھول
ہاتھ کے جھٹکے سے تمہاری طرف پھینکا۔ دل
میں یہ سوچ کر کہ اگر تم نے پھول اٹھا لیا تو
تم ہی میرے خواب کی تعبیر ہو گے۔ اور میری
حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں
نے دیکھا کہ تم نے میری کلائی سے ٹوٹ کر
گرا ہوا پھول اٹھا لیا اور اُس پھول کو تم نے
چوما بھی تھا۔ تمہیں یاد ہے نا!"

انور نے گلنار کی پیشانی چوم کر کہا۔

"دو بار چوما تھا۔"

"پھر میں نے دوسرے روز بھی تمہیں دیکھا
سردار کو وہاں تمہارا آنا سخت ناگوار گزرتا
تھا۔ اس نے ایک رات مجھے کہا بھی کہ وہ
پردیسی محض تمہاری وجہ سے آتا ہے۔ میں
نے کہا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں

تو اُسے جانتی بھی نہیں۔ حالانکہ مجھے یوں
لگ رہا تھا جیسے میں تمہیں جنم جنم سے جانتی
ہوں۔ اس کے بعد تم نے چشمے پر ملاقات
ہوئی۔ سردار شمور نے ہمیں پکڑ لیا اور اس
کے بعد جو کچھ ہوا وہ تم اچھی طرح سے جانتے
ہو۔"

انور چپ چاپ بیٹھا گلنار کی داستانِ محبت سنتا رہا۔ وہ گلنار کی گہری اور خاموش محبت سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اُسے اپنی محبت کی صداقت پر بھی یقین پختہ ہو گیا تھا۔ اس نے گلنار کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ گلنار کا جسم کانپ رہا تھا اور یوں گرم تھا جیسے بخار سے تپ رہا ہو۔ انور نے گلنار کی پیشانی پر ہاتھ رکھا مگر وہاں بخار کے آثار بالکل نہیں تھے۔

"مجھے تمہاری داستان نے بڑا متاثر کیا ہے
گلنار! یقین کرو میں ہی تمہارا آدمی ہوں جو
تمہارے کھیتوں میں ہل جوتنے گیا تھا اور
جس نے خواب میں آ کر تمہیں تمہاری آنے
والی زندگی کی ایک جھلک دکھائی تھی۔"

گلنار نے انور کے سینے پر سر لگا کر کہا۔

"پھر تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتے؟"

انور کے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ جیسے دودھ پیتے پیتے اچانک منہ میں کوئلہ آ گیا ہو۔

"شادی ایک بے معنی بات ہے گلنار!
یہاں ہماری شادی کرنے والا کون ہے
میں کہتا ہوں جب انسان جنگلوں میں رہتا
تھا وہاں اس کی شادی کب ہوتی تھی حالانکہ

مرد ہمیشہ عورتوں سے پیار کرتے تھے جب
ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں ایک
دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عہد
کئے ہوئے ہیں پھر ہمیں شادی کی کیا ضرورت
ہے۔ کیا یہی شادی نہیں ہے؟ اس سے
بڑھ کر اور شادی کیا ہو سکتی ہے!"

گلنار نے کہا۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں تم سے
شادی کر کے ایک گھریلو عورت بن کر
زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ میرا اپنا گھر
ہو۔ جہاں میرے خاوند کے بچے ہوں
میرے بچوں کا باپ ہو۔ تم ہی کہو شادی
کے بغیر بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟ کبھی ایسا ہو
سکتا ہے؟"

انور سر ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ گلنار کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں سمجھا سکتی۔ وہ عورت ہے اور ہر عورت مشرقی ہوتی ہے۔ وہ مشرق میں رہتی ہو خواہ مغرب میں۔ انور کو صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ زہر اُسے ایک بار پھر کھانا پڑے گا۔ یہ غلطی اُسے ایک بار پھر کرنی ہو گی۔ اور جس قصے کا انجام اس قدر درد انگیز ہوا تھا۔ وہی قصہ اُسے ایک بار پھر دہرانا ہو گا۔ اس نے گلنار کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"اگر تم اسی میں خوش ہو تو میں تم سے شادی
کرنے پر تیار ہوں۔"

گلنار کا چہرہ خوشی اور شرم سے سرخ ہو گیا۔

"مگر گلنار! یہاں ہماری شادی کون کرے گا؟"

گلنار نے کہا۔

"ہمارے درمیان خدا جو موجود ہے۔ خدا
تو ہر جگہ موجود ہے نا! ہم خدا کو گواہ بنائیں
گے۔"

انور نے گلنار کو سینے سے لگا لیا اور کے دہکتے ہوئے شہد بھرے ہونٹوں پر اپنے
ہونٹ رکھ دیئے۔ عین اسی وقت انور نے دیکھا کہ آگ پر رکھے ہوئے مٹکے میں سے دودھ
اُبل اُبل کر باہر گر رہا تھا۔

دوسرے روز انور اور گلنار کی شادی ہوگئی۔

انور نے گاؤں جاکر داڑھی منڈوائی، بال بنوائے۔ گلنار کے لئے ایک چولی اور ایک
نیا لہنگا خریدا۔ کچھ مٹھائی اور چائے خریدی۔ شادی شام کے وقت سرانجام پائی۔ گلنار
نے جھیل کنارے ایک جگہ جھاڑیوں کی اوٹ میں غسل کیا۔ نئے کپڑے پہنے۔ پھولوں کے
گجرے بنا کر بالوں اور کلائیوں میں سجائے اپنے اور انور کے گلے میں پھولوں کے ہار
ڈالے اور دونوں چیڑ کے ایک پرانے درخت کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ گلنار نے انور کا
اور انور نے گلنار کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ انور نے کہا۔

"اے خدا! میں تجھے حاضر و ناظر جان کر
اقرار کرتا ہوں کہ گلنار آج سے میری منکوحہ
بیوی ہے اور میں اس کا خاوند ہوں۔ تو
گواہ رہنا"

گلنار نے بھی آنکھیں بند کر کے انور کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"اے خدا! میں تجھے حاضر و ناظر جان کر اقرار
کرتی ہوں کہ انور آج سے میرا خاوند ہے
اور میں اس کی منکوحہ بیوی ہوں۔ تو گواہ رہنا"

اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کے منہ میں مٹھائی ڈالی۔ ایک
دوسرے کو بوسہ دیا اور خود ہی ایک دوسرے کو مبارک سلامت کرتے ہنسی خوشی
واپس آگئے۔ غار کے باہر پتھروں کے چبوترے کو صاف کر کے گلنار نے پتے بچھا
کر ان پر مٹھائی، پھل اور بکری کے دودھ سے بھرے ہوئے دو کٹورے رکھ دیئے
تھے۔ شادی کی رسم سے فارغ ہو کر دونوں میاں بیوی نے خوب کھایا پیا۔ بکریوں
کے گلے میں بھی پھولوں کے ہار ڈالے۔ انور نے کہا۔

"یہ ہمارے براتی ہیں"

گلنار نے کہا۔

"ان میں سے ایک میری ساس بھی ہے"

دونوں قہقہے لگا کر ہنس پڑے اور جھیل کنارے جنگل کی سیر کو نکل گئے۔ کافی دیر
وادی کے درختوں اور سبزہ زاروں میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے۔ جب
وہ سیر و تفریح سے خوب لطف اندوز ہو لئے تو واپس اپنے گھر یعنی غار میں آگئے۔
انہوں نے غار کا دروازہ بند کر لیا اور آگے مندا پھیلا دیا۔ طاق میں دیا جل رہا
تھا اور آگ پر جو ہنڈیا رکھی تھی اس میں چائے اُبل رہی تھی۔ دونوں نے مل کر چائے
پی۔ گلنار کو چائے بالکل پسند نہ آئی۔ اس نے زندگی میں اس رات کوئی دوسری
یا تیسری بار چائے پی تھی۔

انور نے گلنار کا چہرہ جو خوشی سے سرخ ہو رہا تھا اور جہاں حیا کی لالی جھلک
رہی تھی اُوپر اُٹھایا۔

"گلنار! اب تو خوش ہو نا؟"

"بہت"

غار کی فضا نیم گرم تھی۔ باہر سرد ہوا چل رہی تھی۔ اس روز آسمان پر کچھ بادل
بھی چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے دونوں بکریوں کو غار کے اندر ہی باندھ رکھا
تھا۔ بکریاں جگالی کر رہی تھیں۔ چھوٹی بکری کسی وقت ممیا اُٹھتی تھی۔ انور نے کہا۔

"تمہاری سانس تمہیں بُلا رہی ہے"

گلنار ہنس پڑی۔ اس کے دانت موتیوں کی لڑی کی مانند جھلملا اُٹھے۔ انور نے بے اختیار ہو کر اُسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اپنے ہونٹ گلنار کے نرم و نازک جلتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

آج انور کے ہونٹ بھی جل رہے تھے۔ اس کا سارا بدن ایک خشک پیاسا ہونٹ بن کر جل رہا تھا، سُلگ رہا تھا۔ اس نے گلنار کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"میں آج اپنی خوش قسمتی پر جتنا بھی ناز کروں
کم ہے گلنار! آج میرے آسمان پر پہلی بار
سورج طلوع ہوا ہے۔ پہلی بار دھوپ
کی سنہری کرنوں نے آنچل لہرائے ہیں۔
میں زندگی میں پہلی بار چاند کو اپنے دونوں
ہتھیلیوں میں اُترتا محسوس کر رہا ہوں۔
آج کی رات صرف میرے لئے اس زمین
پر آئی ہے۔ اگر ہماری شادی نہ ہوتی تو یہ
دن کبھی غروب نہ ہوتا"

گلنار کو جیسے جادو کی چھڑی نے چھو لیا تھا۔ وہ ایک عقیدت مند پجاری کی طرح انور کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے بالوں میں پھول تھے۔ گلے میں پھول تھے۔ کلائیوں میں پھول تھے۔ آنکھوں میں پھول تھے۔ وہ پھولوں کا ایک گلدستہ بنی بیٹھی تھی جسے انور اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لینا چاہتا تھا۔ انور نے اپنے گلے کا ہار اُتار کر گلنار کے گلے میں پہنا دیا۔

"میں اس قابل نہیں بابو۔"

"شی!"

انور نے گلنار کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی۔

"دنیا میں پھول اس لئے کھلتے ہیں کہ تم
باتیں کرتی ہو۔ ان میں خوشبو اس لئے پیدا
ہوتی ہے کیونکہ تم سانس لیتی ہو"

اس کے بعد وہاں اندھیرا چھا گیا۔ روشنی کے غبارے اُڑنے لگے۔ پھولوں کی بارش ہونے لگی اور پھر رات نے ایک ایک کر کے ستاروں کے دیپ بجھانے شروع کر دیئے۔

۱۲

نجمہ کو گھر سے نکلے دس روز ہو گئے تھے۔

مگر ابھی تک انور کا کوئی سراغ نہیں مِل سکا تھا۔ بابا رجو تو قریب قریب نااُمید ہو گیا تھا۔ نجمہ کا دل بھی ٹوٹ چکا تھا لیکن وہ نااُمید نہیں تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ انور کو ڈھونڈھ کر رہے گی۔ اگرچہ اب لوگوں سے انور کی نشانیاں مِلنا بھی بند ہو گئی تھیں دوسری طرف خانہ بدوشوں کا بھی نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انور اور گلنار سفر ترک کر کے ایک جگہ پہاڑ کے دامن میں میاں بیوی بن کر آباد ہو گئے تھے۔ دوسرے سردار شمور نے گلنار کی تلاش کے لئے وادیوں کے عام راستے سے ہٹ کر گہری گھاٹیوں کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ رجو بابا کو کبھی خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ خانہ بدوش اس طرف جا سکتے ہیں۔ سردار شمور بھی کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرتا اگر گلنار اُسے چھوڑ کر نہ چلی جاتی۔

سردار شمور تو گلنار کے تعاقب میں اپنے بوڑھے مشیر کی قیادت میں قریب قریب ٹھیک راستے پر چلے آ رہے تھے۔ لیکن نجمہ اور بابا رجو راستے سے بھٹک گئے تھے۔ وہ جس پگ ڈنڈی یا پہاڑی راستے پر چلے جا رہے تھے اُدھر سے خانہ بدوشوں نے اپنا رُخ بدل لیا تھا۔ مگر محبت کی ماری وفا کی پُتلی نجمہ کے دل کا رُخ کوئی نہیں بدل سکا تھا۔ وہ اپنی دھن میں چلی جا رہی تھی۔ اس کا رنگ سفر کی صعوبتیں اُٹھا اُٹھا کر پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے

اور آدھے سر کی درد بھی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن وہ خالی ہاتھ، انور کے بغیر واپس پلٹنے کا نام بھی نہیں لے رہی تھی۔

ایک روز آسمان پر بادل چھا گئے اور بڑے زور کا طوفان آ گیا۔ آندھی اور بارش نے چلنا مشکل کر دیا۔ طوفان اتنے زور کا تھا کہ ٹھہرا بھی نہیں جا رہا تھا۔ سیاہ بادل وادیوں کے درختوں میں اُتر آئے تھے اور ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ رجو بابا نے نجمہ کو برساتی اوڑھا دی اور اس کے گھوڑے کی باگ دوسرے گھوڑوں سے باندھ دی۔ طوفان بڑے زوروں کا تھا۔ انتہائی تیز و تند ہوا چل رہی تھی درخت دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ ہوا کانوں میں دہشتناک سیٹیاں بجا رہی تھی۔ ان لوگوں نے بہتیرا سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر طوفان کے آگے اُن کے قدم جم نہ سکے۔ ہوا کے رُخ پر وہ بے اختیار ہو کر چلنے لگے۔ وہ راستے سے بھٹک گئے اور ایک ایسی وادی میں نکل آئے جہاں سیاہ پتھروں سے سر پٹختا، کف اُڑاتا ایک تنگنائے میں سے شوریدہ سر غضب ناک دریا بہہ رہا تھا۔

سردار شمور کو بھی قافلے سمیت اسی طوفان نے آ لیا۔ اُنہوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر طوفان کے زور کے آگے اُن کی بھی کوئی پیش نہ گئی۔ قیامت خیز ہواؤں نے اُنہیں بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

اس رات انور اور گلنار اپنی غار میں ایک دوسرے سے لگے طوفان کی گرجدار چیخیں اور شور سُن رہے تھے۔ جھرنے دریا بن کر دھڑا دھڑ بہہ رہے تھے۔ پہاڑوں پر سے پتھر پھسل پھسل کر گر رہے تھے۔ درخت ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے جا رہے تھے۔ گلنار کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ غار کا دروازہ طوفانی ہواؤں کو بالکل نہ روک سکتا تھا۔ انور نے دروازے کے آگے بمندہ ڈال کر پتھر چُن دیئے تھے۔ پھر بھی ہوا پتھروں میں سے چیختی، چلاتی، سر ٹکراتی اندر آ رہی تھی۔ طاق میں رکھا ہوا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ الاؤ کی آگ پر انور نے پتھر کی سِل رکھ دی تھی۔ ایک بار ہوا کا جھونکا آیا اور دیا بُجھ گیا۔

گلنار نے انور کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"گھبراؤ نہیں گلنار! میں جو تمہارے پاس
ہوں۔"

"ہائے کتنی خوفناک رات ہے۔ ایسے
لگتا ہے جیسے قیامت آگئی ہے۔"

انور نے گلنار کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

"انسان کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ
خوفناک طوفان آیا کرتے ہیں گلنار! انسان
ان ہیبت خیز طوفانوں سے بھی زیادہ مہلک
ہے۔ زیادہ خطرناک ہے۔"

اندھیرے میں دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور انہوں نے بہت جلد ایک دوسرے کے ہونٹ تلاش کر لئے۔ برق و باراں کا طوفان رات بھر جاری رہا۔ جنگل ساری رات شور مچاتے رہے۔ بادل گرجتا رہا اور بجلی کڑکتی رہی اور موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سال بھر کا پانی آج رات ہی کو برس جائے گا۔ انور اور گلنار کو بہت جلد ایک دوسرے کی آغوش میں نیند آگئی۔

صبح انہوں نے اٹھ کر دیکھا کہ باہر کئی درخت جڑ سے اکھڑ کر اوندھے منہ زمین پر پڑے تھے۔ پھلدار پودوں کا تو برا حال ہو رہا تھا۔ دوسرے پہر دھوپ نکل آئی۔ اور دھلے دھلائے درختوں کے پتے اور سیاہ پتھریلی چٹانیں چمکنے لگیں انور اکھڑے ہوئے پودوں کی دیکھ ریکھ میں مشغول ہو گیا اور گلنار بکریوں کا دودھ دوہ کر انہیں مٹکے میں ابالنے کے لئے غار کے اندر لے گئی۔

جب طوفان رکا اور دن کی روشنی نمودار ہوئی تو رجو بابا اور اس کے دونوں بیٹوں نے نجمہ کو گھوڑے پر سے اتارا۔ نجمہ نے دوسرے خشک کپڑے پہنے۔ سر اور کانوں کے گرد گرم مفلر لپیٹا۔ لمبا کوٹ پہنا اور ایک جگہ پتھروں پر بیٹھ گئی۔ رجو بابا کا بڑا لڑکا

سٹوو جلا کر چائے تیار کرنے لگا اور دوسرا لڑکا گھوڑوں کی مالش کرنے اور انہیں چارہ وغیرہ کھلانے میں مصروف ہو گیا۔ رجو بابا نجمہ کے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا۔

"بیٹی! طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں بابا!"

نجمہ نے نقاہت سے کہا۔ حقیقت میں اس کے سر میں شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ جو گولیاں لے کر چلی تھی وہ ختم ہو گئی تھیں۔ مگر یہاں سوائے صبر کرنے کے اور درد کی اذیت چپ چاپ سہہ جانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا اس لئے اس نے اپنی تکلیف کا اظہار رجو بابا کے سامنے کرنے سے گریز کیا۔

رجو نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم راستے سے بھٹک گئے ہیں اور
کوئی چار میل ادھر کو نکل آئے ہیں۔"

"یہ کونسا علاقہ ہے بابا؟"

رجو نے دور پہاڑیوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"اگر میرا قیافہ غلط نہیں تو ہم کافرستان کی
سرحد کے قریب قریب پہنچ گئے ہیں۔"

نجمہ نے مایوسی کے عالم میں کہا۔

"اب ہم کدھر جائیں گے؟"

رجو نے آہستہ سے کہا۔

"میری مانو بیٹی! یہاں سے ہم واپس ہو
لیتے ہیں۔ انور میاں کو ہم اس طرح کبھی
نہیں تلاش کر سکیں گے۔ خدا جانے وہ
کدھر ہیں اور ہم کدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے
پھر رہے ہیں۔"

نجمہ نے سر اٹھا کر کہا۔

"بابا! میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گی۔ ہاں اگر تم میرے ساتھ آگے نہیں جانا چاہتے تو بڑی خوشی سے مجھے چھوڑ کر واپس جا سکتے ہیں۔ میں اکیلی ہی سفر جاری رکھوں گی۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا بیٹی! بھلا میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ جب تک منزل کا ٹھیک طرح سے علم نہ ہو یونہی پہاڑوں کی خاک چھانتے رہنے سے کیا فائدہ؟ مجھے یقین ہے خانہ بدوشوں نے اپنا راستہ کہیں نہ کہیں سے بدل لیا ہے۔ ادھر سے رہی سہی کسر اس طوفان نے پوری کر دی ہے اب تو ہمیں واپس جانے کے لئے بھی کسی سے راستے کا صحیح رُخ دریافت کرنا ہوگا۔"

رنجو بابا کے لڑکے نے چائے کی پیالیاں لا کر رنجو بابا اور نجمہ کو دیں۔ نجمہ نے گرم گرم چائے پی تو اس کے سر درد میں کچھ افاقہ ہوا۔

"رنجو بابا! میں اپنے خاوند کی تلاش میں گھر سے نکلی ہوں۔ خدا جانے میرے باپ کا کیا حال ہوگا۔ وہ کس قدر پریشان نہیں ہو رہے ہوں گے۔ میں نے انہیں

جو تار دیا تھا اس میں یہی لکھا تھا کہ میں انور کی تلاش میں یہاں سے معتبر آدمیوں کے ساتھ آگے جا رہی ہوں آپ فکر نہ کریں کہ میں اپنے اس مشن میں کامیاب ہو کر واپس لوٹوں پھر بھی میں جانتی ہوں غم سے آدھے رہ گئے ہوں گے۔ اس کے باوجود میرے پاؤں مضبوط ہیں اور وہ بالکل نہیں ڈگمگا رہے لیکن میں تم لوگوں کو مجبوراً اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ تم بخوشی، واپس جا سکتے ہو۔ تم اگر چاہو تو میں سارے پیسے تمہیں ابھی دیئے دیتی ہوں۔"

رنجو بابا کو بڑی شرم محسوس ہوئی۔ اس نے کہا۔

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے بیگم صاحبہ! میں تمہیں بھی اپنی بیٹی ہی سمجھتا ہوں۔ اگر تم پریشان ہو تو میں اس پریشانی میں بھاگ اُٹھنے یا تمہیں اکیلا چھوڑ دینے کی بجائے تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گا۔ تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔"

نجمہ کی جان میں جان آئی۔ اس نے ایک طرح سے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"تمہارا شکریہ بابا! میں تمہارے ہوتے ہوئے اس لمبے اور پُرخطر سفر میں اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتی ہوں۔"

اس کے بعد یہ مختصر سا قافلہ ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور جا کر وہ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ یہ بستی ایک منزلہ چھوٹے چھوٹے بے ہنگم سے مکانوں پر مشتمل تھی جن کی چھتیں ڈھلوانی تھیں۔ پچھلی رات کے طوفان کی وجہ سے اکثر مکانوں کی چھتیں اُڑ گئی تھیں۔ اور لوگ ان کی مرمت میں لگے ہوئے تھے۔ پتھریلے راستوں پر چیڑ کے درخت جڑ سے اُکھڑ کر گرے پڑے تھے۔ کچھ لوگ انہیں راستے سے ہٹا رہے تھے۔ یہاں رجو بابا نے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کافرستان کی سرحد کے آس پاس پھر رہے ہیں۔ بہر حال رجو نے راستوں اور سمتوں کا تعین کر لیا۔

باتوں ہی باتوں میں رجو نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ کبھی اس نے کسی ایسے آدمی کو تو ادھر نہیں دیکھا جو شہر والوں ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہو؟ دیہاتی نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ پھر کچھ دیر غور کر کے بولا۔

"سنا ہے گڑھی راجہ میں لوگوں نے
ایک ایسے آدمی کو دیکھا ہے جس نے
شہر والے بابوؤں ایسے کپڑے پہنے
ہوئے تھے اور جو کبھی کبھی اُن کے ہاں
سے چیزیں خرید کر لے جاتا ہے۔"

رجو نے جلدی سے پوچھا۔

"گڑھی راجہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

دیہاتی نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دور کیا ہے بابا! وہ سامنے والی پہاڑی
کے دامن میں ہے۔ یہ ٹیلہ پار کرو گے
تو گڑھی کے مکان دکھائی دینے لگیں گے
جھیل کنارے وہی تو ایک گاؤں ہے۔"

جب رجو کی زبانی بجّہ کو اس خوش خبری کا علم ہوا تو اُس کے سر کا درد بالکل جاتا رہا اور وہ انتہائی جوش اور شوق کے ساتھ گڑھی راجہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا اور آنکھوں میں غم کے آنسو تھے۔

سورج نے مغربی پہاڑیوں کی طرف جھکنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی ہی سرد اور خشک سی ہوا چلنے لگی تھی جس کی وجہ سے درختوں پر سے بسنتی خزاں رسیدہ پتے یہاں وہاں گر جاتے۔ گلنار نے بکریوں کے دودھ سے بھرا ہوا کٹورا غار میں آگ جلا کر رکھا تھا اور خود غار کے دروازے کی مرمت کر رہی تھی جو رات طوفان کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ انور ابھی تک پھلدار درختوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگا ہوا تھا وہ دونوں قریب قریب ہی تھے اور اپنے اپنے کام میں لگے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے چلے جاتے تھے۔ انور نے پوچھا۔

"اور اگر لڑکی ہوئی — تو؟"

گلنار نے کوئی جواب نہ دیا۔

"جواب کیوں نہیں دیتی؟"

"پھر تو اور بھی اچھا ہو گا۔"

"کیوں نہیں۔ مجھے ایک پیاری سی چھوٹی
سی بیٹی مل جائے گی اور تمہیں گڑیا مل جائے
گی۔"

"میں کوئی بچی ہوں جو گڑیا سے کھیلوں گی۔"

انور ہنس پڑا۔

"اور تو کیا کوئی نانی اماں ہے؟ ارے عورت
تو ہمیشہ بچی ہی رہتی ہے۔"

"ہٹو! یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا۔"

"یہی تو اصل بات ہے گلنار بی بی۔"

"شٹ اپ"

اچانک فضا میں سردار شمور کے ہنٹر کی ہیبتناک پٹاخہ نما آواز گونج اٹھی۔ گلنار اور انور نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ گلنار پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ وہ مُردہ بنی وہیں کی وہیں بیٹھی سردار شمور کو ذرا فاصلے پر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کھڑے مسکراتے دیکھتی رہی۔

"ہوشیار ہو جاؤ تم دونوں سے سردار شمور
اپنا انتقام لینے آن پہنچا ہے۔ تم دنیا
کے کسی بھی پوشیدہ گوشے میں چلے جاؤ
شمور کی نگاہیں تمہیں ضرور ڈھونڈ لیں گی۔"

اس کے ساتھیوں نے خنجر ہاتھوں میں سونت رکھے تھے۔ سردار کے ہاتھ میں صرف ہنٹر ہی تھا۔ وہ دانتوں کو چبا رہا تھا اور بار بار تھوک رہا تھا۔ اس کے مکروہ چہرے پر انتہائی فاتحانہ ہنسی تھی۔ اس نے گلنار کے قریب آکر ہنٹر کے دستے سے اس کا چہرہ اُوپر کیا اور پچکار کر بولا۔

"کیوں جی! ابھی اس عاشق سے جی نہیں
بھرا؟ تم تو بڑی گھر گرہستن ہو گئی ہو۔ معلوم
ہوتا ہے جیسے کسی کی بہو ہو۔ خوب گھر بنا
رکھا ہے۔ دغار کے اندر جھانک کر ہاہا
چولہا بھی بنا ہوا ہے۔"

پھر اُس نے گلنار کو بالوں سے پکڑ کر ایک طرف زور سے گھسیٹا اور ہنٹر کا ایک زبردست ہاتھ اس کی پیٹھ پر مار کر چلایا۔

"کمینی! تجھے ہر سال ایک نیا عاشق چاہیے
تو میرے انتقام سے واقف نہیں تھی؟"

گلنار بلبلا اٹھی۔ انور وحشی چیتے کی طرح سردار شمور پر جھپٹ پڑا اور اُس

نے ایک ہی دھکے سے شمور کو زمین پر گرا لیا۔ سردار کے ساتھیوں نے انور کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ سردار نے زمین سے اُٹھتے ہی انور کے دو زور دار چانٹے رسید کر دیئے۔

"ذلیل شہری کتے! تیری یہ جرأت، ابھی
تجھے بھی مزا چکھاتا ہوں۔ گلنار! ادھر آؤ۔"

سردار شمور نے کڑک کر گلنار کو اپنی طرف بلایا۔ گلنار بُت سی بنی اس کی طرف آگئی جیسے اس پر جادو کر دیا گیا ہو۔ سردار شمور نے اپنے نیام سے خنجر نکال کر گلنار کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

یہ لے خنجر اور ہمارے سامنے اسے اپنے
عاشق کے سینے میں اُتار دے۔"

گلنار نے دہشتناک نگاہوں سے سردار کو دیکھا۔ سردار نے اشارہ کیا اس کے ساتھیوں نے خنجر کی نوکیں گلنار کے جسم سے لگا دیں۔ سردار نے چیخ کر کہا۔

"اگر تم نے انکار کیا تو یہ سارے خنجر تیرے
جسم میں اُتار دیئے جائیں گے۔ تیری یہی
سزا ہے۔"

گلنار نے سردار کے ہاتھ سے خنجر لے لیا۔ سردار کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ اس کا مقصد ہی یہی تھا کہ وہ گلنار کے ہاتھوں اس کے عاشق کو موت کے گھاٹ اُتارے۔ گلنار نے ایک نظر سردار کو اور ایک نظر انور کو دیکھا اور خنجر ہاتھ میں سونتے قدم قدم انور کی طرف بڑھنے لگی۔ انور کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ گلنار سردار کو دھوکا دے رہی ہے۔ لیکن جب وہ باقاعدہ خنجر ہاتھ میں لئے اس کی طرف بڑھنے لگی تو وہ حیران سا ہو کر رہ گیا۔ آخر گلنار نے بھی اُسے دھوکا ہی دیا۔ آخر یہ خانہ بدوش لڑکی بھی اس کی نہ بن سکی۔ گلنار خنجر بکف قدم قدم انور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہر

آدمی اس پر نگاہیں گاڑے کھڑا تھا۔ سردار دانت چباتے ہوئے بڑی گہری دلچسپی سے اُسے تک رہا تھا۔

گلنار نے انور کے پاس جا کر اُسے انتہائی پیار بھری نظروں سے دیکھا انور کو تعجب ہونے لگا۔ گلنار کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جگمگا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر آسمانی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے قریب آ کر خنجر کی نوک انور کے سینے پر رکھ دی اور آنسو بھری آواز میں بولی۔

"کاش! میں تمہیں تیرا بچہ دے سکتی جو
میری کوکھ میں پرورش پا رہا ہے لیکن جو
اب میرے ساتھ جا رہا ہے۔"

اس کے بعد ایک بجلی سی کوندی اور گلنار نے خنجر کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ اپنے سینے پر مارا اور دوسرے لمحے گلنار کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ اچھل رہا تھا۔ انور دم بخود ہو کر رہ گیا۔ سردار شمور کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے ہاتھ سے ہنٹر زمین پر گر پڑا۔ وہ دوڑ کر گلنار کے پاس آیا اور اس نے جھک کر گلنار کی تڑپتی ہوئی لاش کو اپنے زانو پر اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قہر آلود نگاہوں سے انور کی طرف دیکھا اور اپنے آدمیوں سے چیخ کر بولا۔

"دیکھتے کیا ہو کمبختو! ختم کر دو اس ملعون کو
بھی۔"

سردار کا حکم ملتے ہی خانہ بدوش جوان خنجر نکال کر انور پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرے لمحے انور دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور خون میں نہایا ہوا اس کا بدن تڑپنے لگا۔ سردار نے گلنار کی لاش کو زمین پر رکھ دیا۔ گلنار دم توڑ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور چہرہ سفید ہو کر سکڑ گیا تھا۔ شمور نے لاش کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور گرج کر کہا۔

"بیوفا! تیری یہی سزا ہے کہ تو اپنے
عاشق کے ساتھ چیل کوؤں کی خوراک بنے۔"

پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"واپس چلو!"

شمور کے قدم لڑکھڑائے لیکن وہ اپنی ٹانگوں کو ہنٹر سے کوٹتا اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔ سورج مغرب کی جانب غروب ہو رہا تھا۔ اس کی الوداعی سرخ اُداس کرنیں درختوں کی شاخوں میں آگ سی لگا رہی تھیں۔ غار کے دروازے کے ساتھ بندھی ہوئی بکری ایک دو بار ممیائی مگر وہاں کون تھا جو اسے جواب میں محبت سے پکارتا۔

دونوں محبت کرنے والوں کی لاشیں ان کے خود ساختہ پُرسکون گھر کے باہر خاک پر خون میں نہائی ہوئی پڑی تھیں۔ دھوپ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی سورج اپنی طلائی کرنوں کو واپس بلانے لگا۔ پہاڑ کے دامن میں شام کے اولیں افسردہ سائے لبنا شروع ہو گئے۔ ہر طرف گہری موت ایسی چپ چاپ مسلط ہو گئی۔ اس دہشتناک خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک چیخ فضا میں گونجی اور نجمہ گھوڑے پر سے چھلانگ لگا کر "انور" کہتی ہوئی انور کی لاش سے لپٹ گئی۔

رنجو بابا اور اس کے بیٹوں نے بھاگ کر انور کو اچھی طرح دیکھا۔ انور کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ لیکن نبض چل رہی تھی۔ نجمہ نے اپنا منہ انور کے زخموں پر رکھ دیا۔ وہ انور کا خون زمین پر سے اٹھا اٹھا کر اپنے چہرے پر ملنے لگی۔ وہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی اور انور کو آوازیں دے رہی تھی۔ بین کر رہی تھی۔ رنجو بابا نے اُسے سنبھالا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیگم صاحبہ! ہمیں جلدی سے گاؤں پہنچ
کر مرہم پٹی کروانی چاہئے۔ انور ابھی زندہ
ہے صرف خون زیادہ بہہ جانے سے وہ
بے ہوش ہے۔"

نجمہ کو کوئی نہیں سنبھال سکتا تھا۔ رنجو نے نجمہ کو پرے ہٹا کر اپنے بیٹوں کی مدد سے

انور کو اٹھا کر گھوڑے پر ڈالا۔ اپنا کھیس پھاڑ کر اس کے زخم اچھی طرح باندھے۔ نجمہ کو دوسرے گھوڑے پر سوار کروایا اور بڑی تیزی جھیل پار والے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

جب یہ لوگ اپنے انور ــــ اپنے زخمی انور کو لے کر چلے گئے تو اُن کے جانے کے بعد وہاں ایک بار پھر وہی گہری موت ایسی خاموشی چھا گئی۔ اب وہاں سوائے گلنار کی لاش اور غار کے دروازے کے باہر بندھی ہوئی بکریوں کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک بکری زمین پر بیٹھی جگالی کر رہی تھی اور دوسری بے چینی سے بار بار ممیا رہی تھی۔ گلنار کا آدھا مرمت کیا ہوا دروازہ ویسے ہی زمین پر پڑا تھا۔ غار کے اندر پھونس کے بستر رات کو سونے کے لئے لگے ہوئے تھے۔ چولہے پر آگ جلتے جلتے مدھم ہو گئی تھی اور دُودھ اُبل اُبل کر کچھ کٹورے سے باہر گر پڑا تھا اور کچھ کٹورے کے کناروں پر جم گیا تھا۔

اب سورج غروب ہو گیا اور شام کی سسکیاں بھرتی ہوئی ہوا چل نکلی۔ درختوں پر سے خزاں رسیدہ خشک پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گلنار کی لاش پر گرنا شروع ہو گئے۔ پتے گر رہے تھے۔ بکری ممیا رہی تھی۔ غار کے اندر چولہے پر رکھا ہوا دودھ آہستہ آہستہ اُبل رہا تھا اور گلنار کی لاش بے یار و مددگار، بے گور و کفن باہر پتھروں پر پڑی تھی اور شام کے ماتمی سائے اُس پر جھک جھک کر بوسہ دے رہے تھے۔ اور فضاؤں میں ایک پُرانے گیت کی صدائیں چیخیں بن کر گونج رہی تھیں۔

ہم خانہ بدوش ہیں۔
ہم ہوا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔
ہمارا پڑاؤ رات بھر کا ہے۔
ہماری محبت رات بھر کی ہے۔
لوگ اپنے محبوب کو دل دیتے ہیں
ہم اپنے محبوب کو خون دیتے ہیں۔

دھوپ اور شگوفے

اوپن ائیر کیفے کے کیبن میں بیٹھے دو محبت کرنے والوں کے دِل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ ان کی ہر سانس میں محبت کے سُرخ گُلابوں کی مہک تھی۔ اُن کی سرگوشیاں محبت کی خوشبوؤں میں ڈُوبی ہوئی ان گہری وادیوں سے اُبھر رہی تھیں جہاں خزاں کے موسم میں نرگس کے زرد پُھول کِھلتے ہیں۔

کیبن کی فضا میں سُنہری چائے کی خُوشبو تھی۔ سیاہ چشم لڑکی کے لمبے سیاہ بالوں کی خواب انگیز مہک اور ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اور چوڑیوں کی طِلسمی کھنک تھی۔ یہ ایک خواب تھا۔ آدھی رات کو پھُولوں کا مُنہ چومتی شبنم کا خواب! لیکن اس خواب کی تعبیر کیا تھی؟

خوشبوؤں، جواں سال محبتوں اور لازوال رومانوی جذبوں میں ڈوب کر لکھنے والے نامور ادیب اے حمید کا شہرہ آفاق ناول

بارش اور بالکونی

جہاں برف گرتی ہے وہاں پھول بھی کھلتے ہیں۔
جہاں پھول کھلتے ہیں وہاں خزاں بھی آتی
ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں مگر اُن کی خوشبو کبھی نہیں
مُرجھاتی۔ خوشبو اپنے پھولوں کی تلاش میں نکلتی ہے۔
سُوکھے زرد پتوں کو ہوا اُڑا کر لے جاتی ہے۔ اِن سُوکھے پتوں
پر، مُرجھائے پھولوں کی پنکھڑیوں پر محبت کی تحریریں لکھی
ہیں۔ خزاں اِن تحریروں کو نہیں پڑھ سکتی۔ یہ محبت
بھرے خط، یہ سُوکھے پتے، یہ مُرجھائے ہُوئے پھول بگولوں کے ساتھ
رقص کرتے اپنے چاہنے والوں کے دامن میں جا گرتے ہیں اور
کوئی اُنھیں سینے سے لگا کر اپنی گُمشدہ محبت کی یادوں میں
اشکبار ہو جاتا ہے۔

اے حمید کے پانچ ناولٹ ایک کتاب کی شکل میں۔
ہر ناولٹ آسمانِ اَدب پر جگمگاتا ہُوا ستارہ۔ ہر ستارے کی کرنوں
سے پھُوٹتی ہوئی محبت کی بے مثال داستانیں۔ یہ ناولٹ
اُردو کے کلاسیکی ادب کا شاہکار ہیں۔